رات کے جاگے ہوئے

جمال احسانی

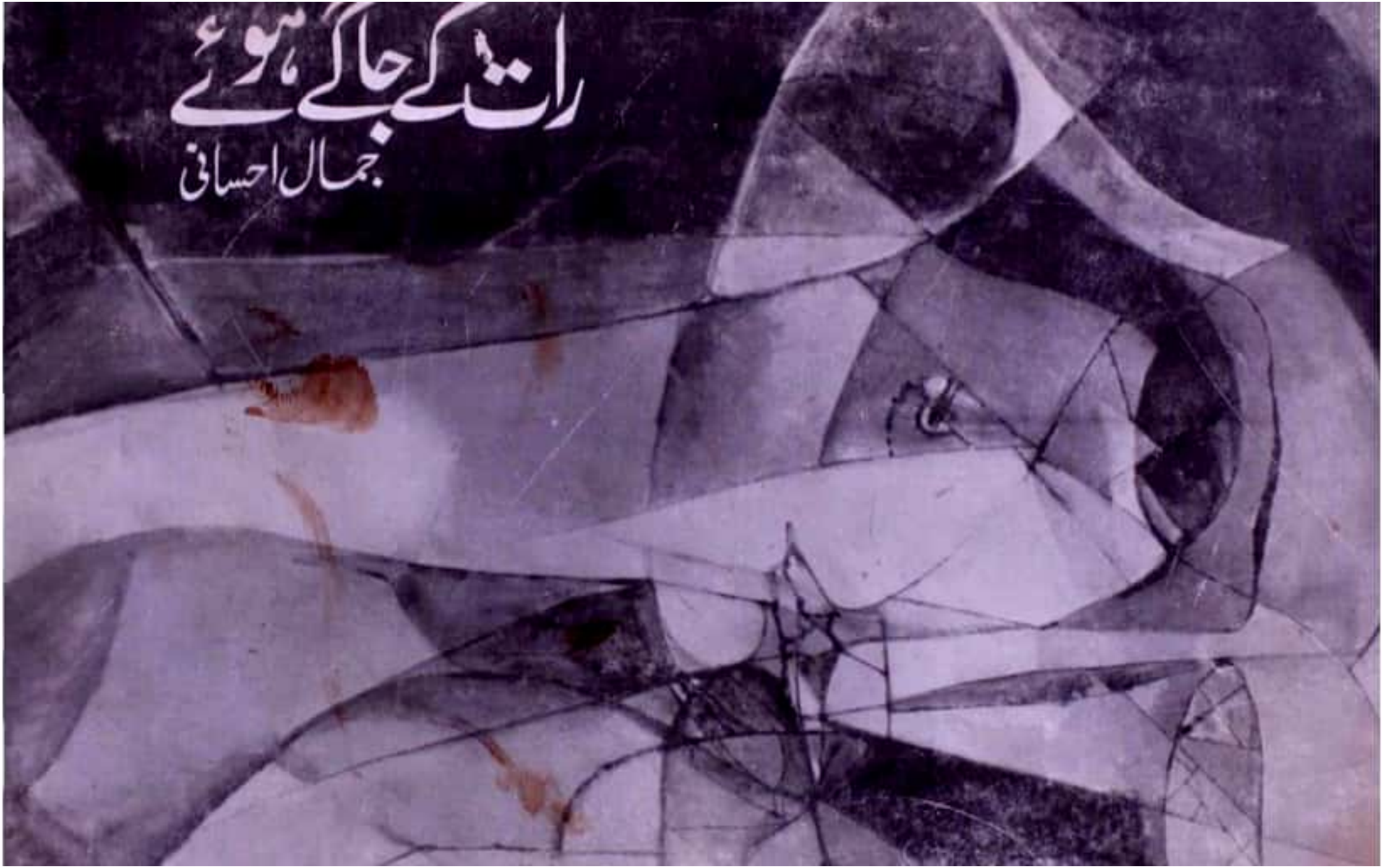

PDF date.
07.10.2018
کتابیں پڑھیے ۔ فیس بک گروپ
سید حسین احسن
03145951212

مُنہ اندھیرے نظر آتے ہیں جو کچھ لوگ یہاں
یہ سحر خیز ہیں یا رات کے جاگے ہوئے ہیں

رات کے جاگے ہُوئے

Accno
7627

شاعر ـــــ جمال احسانی

کتاب ـــــ رات کے جاگے ہوئے

پس ورق ـــــ اقبال مہدی

مشورت ـــــ جعفر عابدی

خوش نویس ـــــ عزم بہزاد

تزئین ـــــ محمد جمیل صدیقی

مہتمم طباعت ـــــ سید امروہوی

اشاعت ـــــ اکتوبر ۱۹۹۶ء

طابع ـــــ سندھ آفسٹ پریس، کراچی

زیر اہتمام ـــــ بزم ارباب سخن

(ایڈریس) ۲/اے بابر اسکوائر فیڈرل بی ایریا، کراچی

قیمت ـــــ چالیس روپے

جملہ حقوق شہناز جمال کے نام محفوظ ہیں

نازک اگر نہیں ہے تو شیشہ ہے بے جواز
بھاری اگر نہیں ہے تو پتھر خراب ہے

ہلال اور مصطفیٰ

تم دونوں کے لیے

اِشارے

جمالؔ احسانی اور اُن کے ہم عصر — ساقی فاروقی گیارہ
جمالؔ احسانی تلاش اور حیرت کے سائبان تلے — جاوید صبا سولہ
شامِ ابد نہ صبحِ ازل کی تلاش میں اِکیس
کُوزۂ دُنیا ہے اپنے چاک سے بِچھڑا ہُوا تیئس
دھرتی بھی آسماں کے برابر خراب ہے پچّیس
کبھی دشت میں نہ غُبارِ راہ میں دیکھتے اٹھائیس
پانی کو پہلے اُس نے مِلایا ہے خاک سے اُنتیس
رہنا نہیں اگرچہ گوارا زمین پر اِکتّیس
عُقدہ کُشائیِ وجود یُوں ہے مُحال بھی مجھے تینتیس
دونوں میں اِک مشترک قدرِ زیاں پوشیدہ ہے پینتیس
ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے سینتیس
تمام ارض و سما کو گواہ کرتے ہوئے اُنتالیس
بجُز چراغ کسی اور کو خبر کیا ہے اِکتالیس
وہ اِس جہان سے حیران جایا کرتے ہیں تینتالیس
واقعی کوئی اگر موجود ہے پینتالیس
فگار سینہ و آفت رسیدہ لوگوں سے سینتالیس
یہ راز ہو ہی چُکا ہے اب آشکار مجھ پر اُنچاس

کفِ شامِ ہجر میں کچھ نہ تھا سرِ شاخسار کوئی نہ تھا	باون
اپنا جب بوجھ مری جان اُٹھانا پڑ جائے	ترپن
وہ یُوں بھی نہیں عشق کی جاگیر سے نکلا	پچپن
جسے بھی ہوں ادب آداب دیکھ سکتا ہے	ستاون
نہ کوئی فال نکالی نہ استخارہ کیا	اُنسٹھ
مدتوں بعد شبِ ماہ اُسے دیکھا تھا	اِکسٹھ
کوئی موضوع ہو تیرا حوالہ اچھا لگتا ہے	تریسٹھ
اُس کی محبتوں کا طریقہ کچھ اور ہے	پینسٹھ
اِس سے کوئی نہیں میری نگہبانی پر	سڑسٹھ
یہ بات معاملۂ اہلِ ہوس سے باہر ہے	اُنہتّر
اِس بار تو غرورِ ہُنر بھی نکل گیا	اِکہتّر
دل میں یادِ رفتگاں آباد ہے	تہتّر
جب اپنی رُوح کے احوال میں شامل نہیں سمجھا	پچھتّر
خود اُس نے تعلق ہی کوئی جب نہیں رکھا	ستتّر
مَیں جو کل پیرہنِ خاک بدل کر آیا	اُناسی
اُس آنکھ کی تحویل میں رہتے ہیں ہمیشہ	اِکیاسی
اپنے ہمراہ جلا رکھا ہے	تراسی
اِس زمزمۂ پردہ آئنہ شرمندہ تھا میرا	پچاسی
مَیں نے اُس شخص کی یاری کو ضروری جانا	اٹھاسی
زنجیر ہلانے کی اجازت نہیں ملتی	نواسی
دیدنی ہوگا سرِ جنگ دروبست مرا	اِکیانوے
سب لوگ سمجھتے ہیں ستمگر کے علاوہ	ترانوے
سبھی کھڑے تھے شریکِ زمانہ ہوتے ہوئے	پچانوے
عجیب بھول بُھلیوں کے درمیاں آئی	اٹھانوے
ہمراہ تیرے منصب و لشکر ضرور ہے	ننانوے
پھر کوئی ملال ہی غلط ہے	ایک سو ایک

نیت نہ تھی سفر کی ہوا بھی خلاف تھی — ایک سو تین
خُدا ہی آپ نہ جب تک زمیں پہ اُترے گا — ایک سو پانچ
کیا اور سزا دے گا زیادہ سے زیادہ — ایک سو آٹھ
رات آتی رہتی ہے دن نکلتا رہتا ہے — ایک سو نو
خُدا نے خوش مجھے اوقات سے زیادہ کیا — ایک سو گیارہ
اُنھی کے واسطے بزمِ جہاں سجائی گئی — ایک سو تیرہ
شاہِ زماں کا تذکرہ کرنے کا وقت ہے — ایک سو پندرہ
سبزے سے کچھ لگاؤ نہ سوسن سے عشق ہے — ایک سو سترہ
روزِ ازل سے خوگرِ سیلابِ گریہ ہے — ایک سو اُنیس
دُنیا میں دُہی کچھ ہے مری کارگزاری — ایک سو اکیس
سب پھول ترے زخم ہمارے ہیں کم و بیش — ایک سو تیئس
سویرا ہو بھی چُکا اور رات باقی ہے — ایک سو پچیس
ہر چند آنکھ تھی ہر منظر لگی ہوئی — ایک سو ستائیس
کبھی جو دُور کا منظر بُلانے لگتا ہے — ایک سو اُنتیس
نئے جہان کا در باز کرنے والی ہے — ایک سو اکتیس
اُس بزم میں دل پہلو بدلتا ہے تو بدلے — ایک سو تینتیس
نہ حال پُوچھتا ہے اور نہ کام پُوچھتا ہے — ایک سو پینتیس
صرف اُس کی رفاقت مجھے کافی بھی نہیں تھی — ایک سو سینتیس
شکوے میں کبھی اور نہ فریاد میں رکھا — ایک سو اُنتالیس
صدق چلتا ہے کوئی اور نہ ہُنر چلتا ہے — ایک سو اکتالیس
خواب کیا تھا مرا تعبیر مجھے کیا دی ہے — ایک سو تینتالیس
وہ صُبحِ وصل کر کے پریشان بھی گیا — ایک سو پینتالیس
جمالِ احسانی، اپنے سفر کا خود ستارہ — ریاض احمد شاد — ایک سو سینتالیس

ساقی فاروقی

جمال احسانی اور اُن کے ہم عصر

میں نے لندن کے ایک نسبتاً گم نام شاعر مسٹر بخش لائلپوری کے بے حد اصرار پر (فون، خط وغیرہ) اُن کا فلیپ لکھ دیا۔ وہ بھی اِس لیے کہ میں نے اس قدر انکار کیا تھا کہ انکار سے بھی شرمندگی ہونے لگی تھی۔ اس عزیز نے کمال حوصلہ مندی سے اپنی کتاب میں میری تحریر شامل کر دی۔ اس کے بعد نہ وہ گم نام رہے نہ میں۔ اُس عبارت کے ایک دو فقرے چشم گزار ہیں۔ "۱۹۳۶ء والوں نے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے مسائل کے اظہار کے لیے جو عوامی پیرایہ اختیار کیا تھا اُس کی یکسانیت اور بے تہی مجھے سخت ناپسند ہے، مگر میری پسند ناپسند سے ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی کی پاپولیرٹی پر کوئی اثر نہیں پڑا بلکہ اُنھی لوگوں کا لہجہ اور الفاظ مستعار لے کر ۳۵ سال (بلکہ ۴۰ سال) بعد بھی حبیب جالب اور احمد فراز جیسے لوگ اپنی ایک پرت کی شاعری کے بل بوتے پر مشاعرے لوٹتے نظر آتے ہیں۔ آپ سے اتنی درخواست ہے کہ اگر آپ مندرجہ بالا شاعروں کی شاعری سے شغف رکھتے ہیں تو پھر مسٹر بخش لائلپوری کا کلام بھی پڑھیے۔" بظاہر یہ فقرہ بے ضرر تھا، میں نے دانستہ اسے ضرر رساں کر دیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دونوں جہاں دیدہ عندلیب (جن پر ساٹھواں برس یا تو لگ چکا ہے یا لگ رہا ہے) سُرمہ اور خضاب لگا کر آہ و زاریاں کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ تیس تیس، چالیس چالیس سال تک جہالت کے زور پر شعر لکھنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو "مہرباں چھوڑ آئے، داستاں چھوڑ آئے" یا "شرابیں شرابوں میں ملیں، پھول کتابوں میں ملیں" جیسے فرسودہ رومانی جذبات پر قناعت کرنی پڑتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ٹنڈو آدم اور چک لالہ کے غریب پرور

اور سادہ لوح عوام کو ایذا دینے کے لیے اُنھیں گلقندی سیاست اور سیاسی گلقند چٹاتے رہتے ہیں۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک نیاز حیدر، دآمق جونپوری جیسے لوگ اس قسم کی شاعری کر کے ادبی نسیان کا حصّہ ہو گئے۔ اُن کی ناکامی کا سبب یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ اُن کی نیّت خراب تھی یا عوام کے لیے خیر کے جذبات بُری چیز ہیں، بلکہ یہ کہ شعری جمالیات اور شعری لسانیات کے ساتھ وہ اپنے اکہرے جذبات کی آبیاری نہ کر سکے۔ اُن لوگوں کو تو مُعاف کرنا پھر بھی آسان ہے کہ اُردو ادب میں پہلی بار اِس قسم کی زبان استعمال ہوئی تھی اور ان بیچاروں کو اپنے Pitfalls کی خبر نہ تھی، مگر چالیس سال بعد بھی اُسی زبان میں اُسی قسم کی جُگالی کرنے والوں کی طرف عبرت اور حقارت سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

دُوسری طرف اسلامی ادب کے نعرہ بازوں نے ہماری پیاری زبان کی مقدّس فضاؤں میں اپنے شِکرے چھوڑ رکھے ہیں کہ وہ تازہ خیالی اور دُور بینی کا شکار کر سکیں اور مولوی نعیم صدیقی جیسے جُغادری جنّات رُوحِ شعر کے سر پر سوار ہو کر "عجیب سی اُن کی گُنگُناہٹ، لطیف سی اُن کی بھنبھناہٹ" بلکہ بلکہ کر ہمارے صبر اور غصّے کو چیلنج کریں۔

تیسری طرف جدیدیت کے نام پر اظہار اور ترسیل کا المیہ ہے اور ہر چند کہ افتخار جالب اور انیس ناگی جیسے لوگ ناکام ہوئے، مگر اُن کی عزّت میرے دل میں ہے کہ اُنھوں نے تجربے سے چشم پوشی نہیں کی اور اپنے قد سے بڑھ کر دراز دستی کی کوشش کی۔ میں اُن کا نوحہ بھی پڑھوں گا اور اُنھیں سلام بھی کروں گا کہ شاعری کی نجات نہ کلاسیکی سمندر میں ڈُبکیاں لگانے میں ہے نہ انیس اور دبیر کی جھیلوں میں ڈھیلا پھینکنے میں، بلکہ زبان و بیان کے نت نئے تجربات میں ہے۔ اس میں ناکامی بھی ہو گی اور کامیابی بھی، مگر شاعری شرمندہ نہیں ہو گی۔

میں نہ سیاست کے خلاف ہوں نہ مذہب کے اور ہر چند کہ مذہبی آدمی نہیں ہوں، مگر ایک کمیٹڈ سوشلسٹ ہوں اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ دونوں طرح کے لوگوں کے یہاں اچھی اور بڑی شاعری کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور خود ہمارے یہاں بھی اقبال اور فیض نے دونوں طرح کے امکانات پُورے کر کے دکھا دیے ہیں۔ مگر "مسجدِ قرطبہ" ہو کہ "شب گزیدہ سحر" شعری جمالیات اور شعری لسانیات دونوں رُوح کے تاروں کو چھوتے ہیں۔ کُھلا کہ شاعر کا مسلک چاہے کچھ ہو وہ اپنے شعر کے آہنگ، لفظوں کی نشست، بیان کی تازگی، زبان کے سفر کے علم اور اپنی ذات اور عہد کے شعور کے بغیر نہ آگے جا سکتا ہے نہ پہچانا جا سکتا ہے۔

میں نے تمہید اتنی لمبی اس لیے کر دی ہے کہ آپ یہ سمجھ سکیں کہ کلیشے، پی آر، مشاعرہ بازی،

ریڈیو ٹی وی اور اخباری شہرت بازی سے پاکستان اور ہندوستان کے نئے، تازہ کار، مخلص اور خوش الحان شاعروں کو بد دل ہونے کی ضرورت نہیں اور انھیں اظہار اور بیان کے نت نئے تجربوں کے ساتھ احساس و خیال کے ہفت رنگ آسمانوں اور زمینوں کا سفر جاری رکھنا چاہیے اور صبر سے کام لینا چاہیے کہ دس پندرہ سال شعر کہنے کے بعد نہ کوئی عظیم بن سکتا ہے نہ منفرد لہجے کا مالک ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر اُس میں جان ہوتی ہے تو وہ اپنی انفرادیت کے امکانات کی طرف اپنے عہد کے بالغ اور صاحبِ نظر لوگوں کی توجہ منعطف کرانے میں ضرور کامیاب ہوتا ہے۔ ادب میں تسلیم اور شناخت کا عمل سُست رَو ہوتا ہے (اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے)۔ میں اپنے پیارے دوست گوپی چند نارنگ کی طرح جلد بازی سے کام لے کر صلاح الدین پرویز اور عزیزی افتخار عارف کی طرح جمال احسانی کو شرمندہ نہیں کروں گا کہ نارنگ کی طرح جھینپنے کا یار ابھی مجھ میں نہیں (بعض تحریریں عجیب ہوتی ہیں کہ شاعر اور نقاد دونوں کی شرمندگی کا باعث بنتی ہیں) تو جمال احسانی میں کیا ہے کہ میں نے مروّجہ شعری منظر نامے کا اتنی تفصیل سے جائزہ لیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ۲۵ اور ۳۰ سال کے درمیان (یہ عُمر کا بیان ہے سنہ کا نہیں) کے لکھنے والوں نے کراچی، لاہور، سرگودھا، دلّی، بمبئی اور احمد آباد کی ادبی فضاؤں میں جو تازگی اور پُرکاری کی رنگا رنگ دھنک تانی ہے جمال احسانی کی شاعری اُسی دھنک کا ایک رنگ ہے۔ دس سال پہلے میں اُن کا ایک مصرع شہروں شہروں لیے لیے پھرا تھا "ایک جگہ تو گھوم کے رہ گئی ایڑی سیدھے پاؤں کی" یہ کوئی عظیم مصرع نہیں، مگر انوکھا اور اچھوتا ہے۔ اِس میں عصر بھی ہے اور عصر سے آگے جانے کا امکان بھی۔ اِس میں زبان کے سفر کی کہانی بھی ہے، یعنی یہ کہ اِس قسم کا مصرع دیا شنکر نسیم اور قائم چاند پوری نہیں لکھ سکتے تھے۔ تب سے اب تک جمال احسانی نے عظیم شاعری تو پیدا نہیں کی، مگر تازگیِ احساس اور ندرتِ زبان کا سفر جاری رکھا ہے اور مجھ جیسے لوگوں کو مایوس نہیں کیا ہے۔ "ستارۂ سفر" کے ایسے شعروں کے بعد ؎

تجھ سے اُکتا جانے کی اِک ساعت بھی
تیرے عشق ہی کے دوران میں گزری ہے

خموش ہُوں تو مجھے اتنا کم جواز نہ جان
مرے بیان سے باہر بھی ہیں سبب میرے

وہ جس مُنڈیر پہ چھوڑ آیا اپنی آنکھیں میں
چراغ ہوتا تو تو بھول کر چلا جاتا

دو اُجالوں کو ملاتی ہُوئی اک راہگزر
بے چراغی کے بڑے رنج سہا کرتی ہے

ہے واقعہ بدف سیلِ آب تھا کوئی اور
مرا مکان تو بس راستے میں آیا ہے

بچھڑا تو اِک جہانِ تعلق اُجڑ گیا
جس جس سے رابطے تھے اُسی کے سبب سے تھے

(اور اس طرح کے بے شمار مصرعے اور اشعار جو ستارۂ سفر کی روشنی ہیں) اِس مجموعے کی غزلوں کے یہ اشعار بھی دیکھتے چلیے جنھیں پڑھ کر میں نے اپنی رُوح میں ایک نشاط انگیزی کی کیفیت محسوس کی ہے

ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے
یا کچھ بھی نہیں ہونے کا ادراک بہت ہے

مقصود مرے ڈھونڈنا کب تھا تجھے، سو میں
جس سمت تُو نہیں تھا اُدھر بھی نکل گیا

بہکا رہا ہے کون مجھے یُوں ترے خلاف
اِک مرتبہ خود اپنی طرف دھیان بھی گیا

مدتوں بعد شبِ ماہ اُسے دیکھا تھا
پر کسی اور کے ہمراہ اُسے دیکھا تھا

جو دل کے طاق میں تُو نے چراغ رکھا تھا
نہ پُوچھ میں نے اُسے کس طرح ستارہ کیا

وہ جس نے دیکھ لیا ہے اُسے نظر بھر کے
پسِ غُبار و تہہِ آب دیکھ سکتا ہے

(اور اس طرح کے بہت سے اشعار اور مصرعے جو اس کتاب کی زینت ہیں)

یہ نہ بھُولیے کہ بہت سے خراب اشعار "ستارۂ سفر" میں بھی تھے اور "رات کے جاگے ہوئے" میں بھی ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ شاعر ابھی تجرباتی دور سے گزر رہا ہے، مگر بُنیادی طور سے تازہ بیانی اور تازہ کاری سے ہم کلام ہے۔ میں کھُلے دل سے اِس مجموعے کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ شاید یہ میری خوش گمانی ہو، مگر مجھے اندیشہ ہے کہ یہ آواز نئی تہہ داریوں سے آشنا ہو کر اور نئے نغمے جنم دے گی۔

۱۸ نومبر ۱۹۸۵ء

جمالؔ احسانی
تلاش اور حیرت کے سائبان تلے
جاوید صبا

تخلیق کی بھول بھلیوں میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پسِ غبار و تہہ آب دیکھنے کی حکمتِ عملی باشعور ہونے کی شہادت ہے، اور یہی شہادت احساس کے اندرونی تناؤ کے فطری نتیجے میں منظر بہ منظر اور سینہ بہ سینہ پھیلتی چلی جاتی ہے ؎

صبح دم دیکھا تو خشکی پر تڑپتا تھا بہت
ایک منظر دیدۂ نمناک سے بچھڑا ہوا

دیدۂ نمناک سے بچھڑا ہوا یہی اندوہ ناک منظر تخلیق کی تجریدیت سے گزرتا ہوا ایک ایسا آئینہ بن جاتا ہے جس میں حیات کے سبھی مناظر زنجیر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ آئینہ آدم کے باطن کا سراپا بھی ہے اور کائنات کا مرقع بھی، صبحِ ازل اور شامِ ابد کے مابین خارجی تغیرات اور اندرونی حیرت و انکشاف کا عکس بھی ہے اور کمیت و کیفیت کا رقص بھی، ابنِ آدم کی مدھم روشنی بھی اور ارتقا پذیر انسان کی باطنی سیاہی کی چکا چوند بھی۔

پیالۂ کون و مکاں کے ساتھ گردش کرنے والے جمالؔ احسانی کی شاعری تلاش آمیز حیرت کا دوسرا نام ہے۔ یہ رات کے جاگے ہوئے نشاطیہ کرب کی وہ نیند ہے جو پہلی ہی کروٹ میں حرام

ہو جاتی ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جو اپنے خمیر میں روایتی ہونے کے باوجود روایت گزیدہ نہیں۔ یہ کہانی گاؤں کی پگڈنڈی کو شہر کی سڑک سے جوڑ کر صنعتی عہد کی پیچیدگیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی خیال خود آگاہی ہے ؎

ذرا اس کرب کا اندازہ کیجے
میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں
(ستارۂ سفر)

ستارۂ جبرئیل سے سرسری گزر کے
رُکی بالآخر نگاہِ آئینہ دار مجھ پر!

یہ خود آگہی انسانی کلیت کا ادراک تو ہے، لیکن نگاہِ آئینہ دار کی تفہیم کا علم نہیں ؎
کیا ہے یہ مجھ کو علم نہیں ہو سکا ابھی
کچھ ہے کہ جو لباس سے باہر فرد ہے

یہی وہ تجسس آمیز بے خبری ہے جو تخلیق کا سنگِ بُنیاد رکھتی ہے — تلاش اور جستجو کا چشمہ اگر ضمیر کے باطن سے پھوٹ بہے تو انسان آتشِ نمرود میں بے خطر کُود پڑتا ہے، اور اگر یہی دھارا ضمیر کے خارجی مُضمرات سے خرام کرے تو شاعری جنم لیتی ہے۔ ایک ایسی شاعری جو ضمیر کے باطن میں پیوست ہونا چاہتی ہے۔ جمالؔ احسانی کی شاعری بھی اسی پس منظر کا ایک منظر ہے۔ یہ شاعری کائناتِ خواہش و امکاں کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں بدن رُوح کی پوشاک سے بچھڑ جاتا ہے اور مادی سیمابیت کی رُوح اپنے بنائے ہوئے دائرے توڑنے لگتی ہے۔

"ستارۂ سفر" سے لے کر "رات کے جاگے ہوئے" تک کا سفر دراصل بتدریج تغیر کی شہادت نہیں بلکہ اچانک رُونما ہونے والی فکری تبدیلی کا اظہار ہے۔ "ستارۂ سفر" میں جمالؔ احسانی بوندا باندی کے درمیان اپنے گھر کی چھت پر کسی چراغ کے ہمراہ بھیگتا نظر آتا ہے اور "رات کے جاگے ہوئے" میں تلاش اور حیرت کے سائبان تلے کسی گُمشدہ کُل کی کھوج میں سرگرداں بھٹکتا دکھائی دیتا ہے ؎
میں کاروانِ لمحۂ آئندہ میں شریک
رہتا ہوں ایک گُمشدہ کُل کی تلاش میں

جمالؔ احسانی اپنے تجربات و مُشاہدات کے اظہار کے لیے کلاسیکی روایت سے انحراف کرتا ہوا

سمعترہ

ذرا کم ہی نظر آتا ہے۔ اس کے ہاں عصری پس منظر میں زبان کی تراش خراش، الفاظ کے حُسن، موزونیت، مُناسبت، بندش کی چُستی، تراکیب کی دل آویزی اور محاورات کی برجستگی کا جُداگانہ استعمال نظر آتا ہے، مثلاً ؂

رونقِ شہر بھی صحرا کی فضا لگتی ہے
دل تو وہ بات کہے گا جو خُدا لگتی ہے
(ستارۂ سفر)

روزِ ازل سے خوگرِ سیلابِ گریہ ہے
شہرِ شکستہ دل کہ لبِ آبِ گریہ ہے

یُوں نہ ہو بول پڑوں میں تری خاموشی پر
اور تجھے بزم سے مہمان اٹھانا پڑ جائے

کیا ہوتا اگر میں نظر انداز نہ کرتا
جو دُوسرا مطلب تری تحریر سے نکلا

بیکار سمجھ کر میں جلا بیٹھا جب اُس کو
اِک کام اچانک تری تصویر سے نکلا

چراغ بُجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
میں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

یہ سیلِ اشک بھی اپنا ہے آنکھ بھی اپنی
کھڑے رہو کہ یہ دریا یہیں پہ اُترے گا

چلے تو ہو سفرِ عشق پر خیال رہے
کہیں چڑھے گا یہ دریا کہیں پہ اُترے گا

نہ کوئی فال نکالی نہ استخارہ کیا
بس ایک صبح یونہی خلق سے کنارہ کیا

محاورات کی برجستگی اور بندش کی دل آویزی کی اہمیت سے قطع نظر تخلیقی جمالیات کی اپنی زبان ہوتی ہے جو نامانوس ہوتے ہوئے بھی اجنبی نہیں معلوم ہوتی۔ جمال احسانی کا یہ گوشہ بیشتر دوسرے شعرا کی طرح نسبتاً کم نمو پذیر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جمال احسانی اس انکشاف سے باخبر ہے اور ہمیشہ اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ جو یہاں ظاہر نہیں ہے وہ کہاں پوشیدہ ہے۔ مجھے جمال احسانی کی یہی ادا اچھی لگتی ہے۔ اور خود بقول جمال احسانی ؎

نازک اگر نہیں ہے تو شیشہ ہے بے جواز
بھاری اگر نہیں ہے تو پتھر خراب ہے

کراچی، اکتوبر ۱۹۸۶ء

جو حرف چاہتا ہوں لکھ نہیں سکا اب تک
زمانہ ہو گیا کاغذ سیاہ کرتے ہوئے

شامِ ابد نہ صُبحِ ازل کی تلاش میں
صدیوں سے ہوں یہاں کسی پَل کی تلاش میں

مَیں کاروانِ لمحۂ آئندہ میں شریک
رہتا ہوں ایک گُمشدہ کَل کی تلاش میں

گردش میں ہوں پیالۂ کون و مکاں کے ساتھ
شاید کِسی کمی و خلل کی تلاش میں

مَیں نے تو اپنے عکس کو محفوظ کر لیا
اب آئینہ ہے ردِّ عمل کی تلاش میں

یک رنگیِ جہاں میں بصد عجز و انکسار
مَیں ہر گھڑی ہوں اپنے بدل کی تلاش میں

اِک مَیں ہی بے یقیں نہیں اِس دہر کا مکیں
ہر چیز ہے جواز و عِلل کی تلاش میں

افسوس بے ارادہ و نیّت سبھی جہاں
رہتے ہیں لوگ حُسنِ عمل کی تلاش میں

کیسے یہاں دُعائے بُزرگاں میں ہو اثر!
سارے درخت رہتے ہیں پھل کی تلاش میں

دُنیا جمالؔ کچھ بھی کہے جانتا ہوں مَیں
سارا سفر ہے میرا غزل کی تلاش میں

کُوزۂ دُنیا ہے اپنے چاک سے بچھڑا ہُوا
اور اِس کے بیچ مَیں افلاک سے بچھڑا ہُوا

اُس جگہ مَیں بھی بھٹکتا پھر رہا ہوں آج تک
جس جگہ تھا راستہ پیچاک سے بچھڑا ہُوا

دن گزرتے جا رہے ہیں اور بجوم خوش گماں
مُنتظر بیٹھا ہے آب و خاک سے بچھڑا ہُوا

صُبح دَم دیکھا تو خشکی پر تڑپتا تھا بہت
ایک منظر دیدۂ نمناک سے بچھڑا ہُوا

اِس جہانِ خستہ سے کوئی توقّع ہے عبث
یہ بدن ہے رُوح کی پوشاک سے بچھڑا ہُوا

جب بھی تولا بے نیازی کی ترازو میں اُسے
وہ بھی نکلا ضبط کے ادراک سے بچھڑا ہُوا

اِک ستارہ مجھ سے مِل کر رو پڑا تھا کل جمالؔ
وہ فلک سے اور مَیں تھا خاک سے بچھڑا ہُوا

دھرتی بھی آسماں کے برابر خراب ہے
چادر ہے جیسی ویسا ہی بسترِ خراب ہے

اِس کائناتِ خواہش و اِمکاں سے اُس طرف
منظر ہے ایک اور وہ منظر خراب ہے

آگاہ مَیں چراغ جلاتے ہی ہو گیا
دُنیا مرے حساب سے بڑھ کر خراب ہے

بیدار بھی ہو نیند سے چارہ گرِ جہاں
حالت ترے مریض کی یکسر خراب ہے

ایسی جگہ اسیرِ نفس کو رکھا گیا
دیوار سے زیادہ جہاں در خراب ہے

اُس کے لیے ہی آئے گی آئی اگر بہار
وہ پھول جو کہ باغ سے باہر خراب ہے

نازک اگر نہیں ہے تو شیشہ ہے بے جواز
بھاری اگر نہیں ہے تو پتھر خراب ہے

دُنیائے پُرکشش بھی ہے، ہر سُو کھڑی ہوئی
نیّت بھی آدمی کی سراسر خراب ہے

آنکھوں سے اب وہ خواب کو نسبت نہیں رہی
اِک عُمر ہو گئی یہ سمندر خراب سے

تاریخ سے محال ہے لانا مثال کا
یہ عہد اپنی رُوح کے اندر خراب ہے

یہ بات بھی چُھپی نہ رہے گی بہت کہ مَیں
اِتنا نہیں ہوں جتنا مقدّر خراب ہے

کچھ ہاتھ خواب میں تھے گریبان پر مرے
اِک شب خیال آیا تھا یہ گھر خراب ہے

بَسنے نہیں تو سَیر کی خاطر چلو جمالؔ
ایک اور شہر چند قدم پر خراب ہے

کبھی دشت میں نہ غُبارِ راہ میں دیکھتے
مجھے دن ڈھلے کسی خیمہ گاہ میں دیکھتے

ذرا دیر کر دی جمال ورنہ اُسے تو ہم
کبھی بزم میں کبھی رزم گاہ میں دیکھتے

پانی کو پہلے اُس نے ملایا ہے خاک سے
پھر اُس کے بعد مجھ کو بنایا ہے خاک سے

اُس نے بھی خاک ہی سے بڑھائی ہے تیرگی
مَیں نے بھی ہر چراغ جلایا ہے خاک سے

زنجیر کر رہے ہیں مناظر حیات کے
آئینہ اُس نے خوب سجایا ہے خاک سے

ہمراز کر کے آتشِ خواب و خیال کو
آبِ رواں پہ نقش بنایا ہے خاک سے

موجود ہے اُس آنکھ کے نزدیک ہی کہیں
اِک شہرِ آرزو کہ بسایا ہے خاک سے

آرام کر کہ پھر کبھی موقع نہ آئے گا
دو چار روز اور یہ سایا ہے خاک سے

اُس نے بھی مجھ پہ تیغِ ستم کھینچ لی جمالؔ
مَیں نے بھی ایک پھول اُٹھایا ہے خاک سے

رہنا نہیں اگرچہ گوارا زمین پر
لیکن اِک آدمی ہے ہمارا زمین پر

طُرفہ کہ رسمِ گریہ و زاری بھی اُٹھ گئی
مشکل تو پہلے ہی تھا گُزارہ زمین پر

پہلے تو دی گئی مجھے بینائی اور پھر
منظر عجیب اُس نے اُتارا زمین پر

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے کو کم نہیں
ٹوٹے ہُوئے دِیے کا کنارا زمین پر

اُس کی نظر بدلنے سے پہلے کی بات ہے
میں آسمان پر تھا ستارہ زمین پر

باقی تو جو بھی کچھ ہے اضافی ہے سب یہاں
اِک آنکھ ہے اور ایک نظارہ زمین پر

دیکھا نگاہ بھر کے مجھے اُس نے پھر جمالؔ
روشن کیا چراغ دوبارہ زمین پر

عُقدہ کُشائیِ وجود، یُوں ہے محال بھی مجھے
رکھنا ہے رازِ آتش و آب و سفال بھی مجھے

ردِّ گماں کے واسطے اپنا کوئی ثبوت دے
اور مدارِ جسم سے آ کے نکال بھی مجھے

ہوتے رہے ہیں عُمر بھر کام دُعاؤں سے مگر
کرتا رہا بہت خراب ایک سوال بھی مجھے

ٹوٹ گئے سبھی بھرم، کیسا وجود، کیسا عدم
اب نہ سنبھال پائے گا تیرا خیال بھی مجھے

عرصۂ کارزار میں آج کسی کے وار سے
جان بچانے کا ہُوا کتنا ملال بھی مجھے

اے نگہِ ستارہ جُو، دیکھ کے مُلتفت تجھے
آج بہت نڈھال ہوں آج سنبھال بھی مجھے

میں کسی اور رنگ میں، تُو کسی اور اُمنگ میں
گزُرا ہے کس قدر گراں تیرا وصال بھی مجھے

ایسا بچھڑ گیا تھا میں خود سے کہ پھر کبھی جمالؔ
مجھ سے نہیں ملا سکی میری مثال بھی مجھے

دونوں میں اِک مشترک قدرِ زیاں پوشیدہ ہے
ناگہاں ظاہر ہوں میں وہ ناگہاں پوشیدہ ہے

ہر نَفَس مَیں اِس تگ و دَو میں بسر کرتا رہا
جو عیاں ہوتا نہیں ہے وہ کہاں پوشیدہ ہے

اب کسی منظر میں آنا ہے سراسر رائگاں
وہ وہیں اچھا رہے گا جو جہاں پوشیدہ ہے

جل گیا تو باغ ہو جائے گا سارا ریگ زار
ایک نقشِ پا کہ جس میں کارواں پوشیدہ ہے

ایک ذرّے میں نہاں ہے رازِ دھرتی کا جمال
اِک ستارہ ہے کہ جس میں آسماں پوشیدہ ہے

کتنی گنجائشیں اُس آنکھ نے رکھی ہیں جمال
ہجر کی آس میں بھی وصل کے امکان میں بھی

ہونے کی گواہی کے لیے خاک بہت ہے
یا کچھ بھی نہیں ہونے کا ادراک بہت ہے

اِک بُھولی ہوئی بات ہے اِک ٹوٹا ہوا خواب
ہم اہلِ محبّت کو یہ املاک بہت ہے

کچھ دربدری راس بہت آئی ہے مجھ کو
کچھ خانہ خرابوں میں مری دھاک بہت ہے

پرواز کو پَر کھول نہیں پاتا ہوں اپنے
اور دیکھنے میں وُسعتِ افلاک بہت ہے

کیا اُس سے مُلاقات کا امکاں بھی نہیں اب
کیوں ان دنوں میلی تری پوشاک بہت ہے .

آنکھوں میں ہیں محفوظ ترے عشق کے لمحات
دریا کو خیالِ خس و خاشاک بہت ہے

تنہائی میں جو بات بھی کرتا نہیں پُوری
تقریب میں مل جائے تو بے باک بہت ہے

نادم ہے بہت تُو بھی جمالؔ اپنے کیے پر
اور دیکھ لے وہ آنکھ بھی نم ناک بہت ہے

تمام ارض و سما کو گواہ کرتے ہوئے
کوئی گزر گیا مجھ پر نگاہ کرتے ہوئے

جو بوجھ اپنے نہیں وہ بھی ڈھونے پڑتے ہیں
اِس آب و خاک سے مجھ کو نباہ کرتے ہوئے

مَیں چُپ کھڑا ہوں یہاں اور گزرتا جاتا ہے
کوئی سوال کوئی اِنتباہ کرتے ہوئے

جہانِ اجر و سزا میں بجز دل آزاری
نہیں سوچتا نہیں کوئی گناہ کرتے ہوئے

جو حرف چاہتا ہوں، لکھ نہیں سکا اب تک
زمانہ ہو گیا کاغذ سیاہ کرتے ہوئے

دماغ نے کہاں مانی کبھی فقیر کی بات
یہ دل ڈرا تھا اُسے بادشاہ کرتے ہوئے

اب اُس پہ ترکِ مراسم کے وقت غور نہ کر
جو بات سوچنی تھی رسم و راہ کرتے ہوئے

جمالؔ وار بھی اوچھا نہیں کیا لیکن
ہُوا تھا رنج بھی اُس کو تباہ کرتے ہوئے

بجُز چراغ کسی اور کو خبر کیا ہے
یہ شام ہونے سے پہلے ہوا کا ڈر کیا ہے

نہ مَیں ہی کُھلتا ہوں تجھ پر نہ تُو عیاں مُجھ پر
ترے سوا ترے اقرار سے اُدھر کیا ہے

مَیں اِک سوال سے نکلوں تو دُوسرے میں رہوں
مرے علاوہ بھی کچھ ہے یہاں، مگر کیا ہے

مگر یہ بات میں ہمسایوں سے نہیں کہتا
کہ یہ امانتِ دیوار و در ہے گھر کیا ہے

ہر ایک گوشۂ کون و مکاں کی سیر کے بعد
جو اپنی سمت نہ لے آئے وہ سفر کیا ہے

خیال آیا مجھے گردشِ زمیں سے جمالؔ
کہیں پہنچنے کی کوشش ہے رہگزر کیا ہے

وہ اِس جہان سے حیران جایا کرتے ہیں
جو اپنے آپ کو پہچان جایا کرتے ہیں

جو صرف ایک ٹھکانے سے تیرے واقف ہیں
تری گلی میں وہ نادان جایا کرتے ہیں

کِسی کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں اکثر
اکیلے پن میں بڑے دھیان جایا کرتے ہیں

مَیں اب کبھی نہ دُکھوں گا کسی کے مرنے سے
کہ شب گزار کے، مہمان جایا کرتے ہیں

جو اصل بات ہے اُس کو چُھپانے کی خاطر
کبھی کبھی غلطی مان جایا کرتے ہیں

یہ بات آتے ہوئے سوچتا نہیں کوئی
کہ سب یہاں سے پریشان جایا کرتے ہیں

جمالؔ ہم تو تجھے یہ بھی اب نہیں کہتے
کبھی کِسی کا کہا مان جایا کرتے ہیں

واقعی کوئی اگر موجود ہے
پھر تو یہ دُکھ عُمر بھر موجود ہے

بیچ کا رستہ نہیں باقی کوئی
یا خُدا ہے یا بشر موجود ہے

اُس کو پانے کی توقّع ہے بہت
جب تلک یہ چشمِ تر موجود ہے

اُس کے ملنے ہی سے پہلے دل میں کیوں
اُس کے کھو جانے کا ڈر موجود ہے

کوئی منزل کیسے تنہا سر کریں
ہر سفر میں ہم سفر موجود ہے

عادتِ خانہ خرابی ہے جمالؔ
ورنہ اچھا خاصا گھر موجود ہے

فگار سینہ و آفت رسیدہ لوگوں سے
یہ ساری رونقیں ہیں آب دیدہ لوگوں سے

جب آنکھ کُھلتی ہے تو کیا خیال آتا ہے
یہ بات کون کرے خواب دیدہ لوگوں سے

یہ پیرہن کی چمک کیوں اُداس کرتی ہے
کبھی یہ پُوچھ تو دامن دریدہ لوگوں سے

عقیدے کا نہیں ہونا بھی اِک عقیدہ ہے
مجھے الگ ہی سمجھ باعقیدہ لوگوں سے

ہر ایک راستہ جاتا ہے مَوت کی جانب
نہ دِل گرفتہ ہو اِن سرکشیدہ لوگوں سے

نیا چراغ کبھی یُوں بھی ہوتا ہے روشن
کہ اختلاف کرے برگزیدہ لوگوں سے

ہر ایک لمحۂ آئندہ کا فسوں ہے نیا
مجھے یہ عِلم ہُوا سن رسیدہ لوگوں سے

یہ راز ہو ہی چکا ہے اب آشکار مجھ پر
ہے اِس جہاں کا تمام دار و مدار مجھ پر

ستارہ و جبرئیل سے سرسری گزر کے
رُکی بالآخر نگاہِ آئینہ دار مجھ پر

عجیب شب ہے کہ غار اندر بھی روشنی ہے
عجب گھڑی ہے کہ فرض ہے انتظار مجھ پر

خزانۂ خاک و شمع کا ورثہ دار ہوں میں
خرامِ ابر و ہوا کا ہے انحصار مجھ پر

بکھر گیا ہے اِک آئینہ ٹوٹ کر نظر میں
ہوئی ہے یہ کائنات گرد و غبار مجھ پر

ہمیشہ رہتا ہوں حالتِ گریہ و دُعا میں
کہ مُنکشف ہے ہر آنے والی بہار مجھ پر

مجھے کبھی اشتباہ سے روکتا نہیں ہے
مرے سوا بھی کسی کا ہے اختیار مجھ پر

اُنھی کے زخموں سے نیم جاں ہے وجود میرا
تری طرف سے ہوئے نہیں ہیں جو وار مجھ پر

بغیر سُود و زیاں جو لمحہ گزر گیا ہے
اُس ایک لمحے کے قرض ہیں بے شمار مجھ پر

نہ کوئی زنجیر میرے پیروں میں ڈالتا ہے
نہ بند کرتا ہے کوئی راہِ فرار مجھ پر

لگامِ اسپِ حیات میرے سپرد کر کے
جمالؔ اُس نے بہت کیا اعتبار مجھ پر

تجھی پہ ٹوٹے نہیں ہیں اذیتوں کے پہاڑ
ہمیں بھی دیکھ کہ تجھ کو بھلا دیا کیسا

کفِ شام ہجر میں کچھ نہ تھا سرِ شاخسار کوئی نہ تھا
وہ گھڑی بھی عشق میں آئی جب پسِ انتظار کوئی نہ تھا

یہی دیکھا کوچۂ عشق میں یہی کلکِ جاں سے رقم کیا
کوئی تھا اگر تو غبار تھا وہاں شہسوار کوئی نہ تھا

اپنا جب بوجھ مری جان اُٹھانا پڑ جائے
دُوسروں کا نہ کچھ احسان اُٹھانا پڑ جائے

اِس قدر عیشِ محبّت پہ نہ ہو خوش کہ تجھے
دُوسرے عشق میں نقصان اُٹھانا پڑ جائے

اِس سرائے میں نہ پھیلائیے اجزائے حیات
جانے کس وقت یہ سامان اُٹھانا پڑ جائے

یُوں نہ ہو بول پڑوں میں تری خاموشی پر
اور تجھے بزم سے مہمان اُٹھانا پڑ جائے

پھر بدل جائے نہ اِس وعدۂ امروز سے تُو
اور ہمیں دُوسرا طوفان اُٹھانا پڑ جائے

کیا تماشا ہو، سرِ کُوچۂ دلدار اگر
میرے جیسا کوئی نادان اُٹھانا پڑ جائے

مَیں تو مر جاؤں اُسی وقت اگر مجھ کو جمالؔ
عشق سے ہاتھ کسی آن اُٹھانا پڑ جائے

وہ یُوں ہی نہیں عشق کی جاگیر سے نکلا
مجبوریٔ نان و نمک و شیر سے نکلا

پایا ہے کِسی دائرۂ خاک میں خود کو
میں جب بھی کِسی حلقۂ زنجیر سے نکلا

یہ سامنے جو ڈھیر خزانے کا پڑا ہے
نقشے سے نہیں لغزشِ رہگیر سے نکلا

وہ جلوہ نُما بام پہ تھا دیر سے لیکن
میں خود ہی اُسے دیکھنے تاخیر سے نکلا

بے کار سمجھ کر میں جلا بیٹھا جب اُس کو
اِک کام اچانک تری تصویر سے نکلا

کیا ہوتا اگر میں نظر انداز نہ کرتا
جو دُوسرا مطلب تری تحریر سے نکلا

دُہری ہوئی جاتی تھی کمر بوجھ سے میری
جب خواب لیے کوچۂ تعبیر سے نکلا

ہوں غالبؔ و اقبالؔ کہ فیضؔ و ظفرؔ اقبال
ہر رنگِ سخن مکتبۂ میرؔ سے نکلا

جسے بھی ہوں اَدب آداب دیکھ سکتا ہے
کوئی بھی شخص ترے خواب دیکھ سکتا ہے

تری نگاہ سے دُنیا کو دیکھنے والا
چراغ کو پسِ محراب دیکھ سکتا ہے

یہ کہہ کے اذنِ سفر دے دیا گیا مجھ کو
کہ تُو ستارے کو مہتاب دیکھ سکتا ہے

دُعا و اشک کی گٹھری سنبھال کر رکھنا
کسی بھی وقت وہ اسباب دیکھ سکتا ہے

وہ جس نے دیکھ لیا ہے اُسے نظر بھر کے
پسِ غبار و تہہِ آب دیکھ سکتا ہے

نہ اپنے ہجر میں پژمُردہ پا کے خوش ہے ہمیں
نہ اپنے وصل میں شاداب دیکھ سکتا ہے

نہ چاہتا ہے کہ ہم حالتِ سکوں میں رہیں
نہ اپنے عشق میں بےتاب دیکھ سکتا ہے

جمالؔ جس کو بھی شک ہو ہماری باتوں پر
ہمارا حلقۂ احباب دیکھ سکتا ہے

نہ کوئی فال نکالی نہ استخارہ کیا
بس ایک صبح یُونہی خَلق سے کنارہ کیا

نکل پڑیں گے گھروں سے تمام سیارے
اگر زمین نے ہلکا سا اِک اشارہ کیا

جو دِل کے طاق میں تُو نے چراغ رکھا تھا
نہ پُوچھ میں نے اُسے کس طرح ستارہ کیا

پرائی آگ کو گھر میں اُٹھا کے لے آیا
یہ کام دل نے بغیر اُجرت و خسارہ کیا

عجب ہے تُو کہ تجھے ہجر بھی گراں گزرا
اور ایک ہم کہ ترا وصل بھی گوارہ کیا

ہمیشہ ہاتھ رہا ہے جمالؔ آنکھوں پر
کبھی خیال کبھی خواب پر گزارہ کیا

مدّتوں بعد شبِ ماہ اُسے دیکھا تھا
پر کسی اور کے ہمراہ اُسے دیکھا تھا

کیا خبر تھی کہ کہانی کوئی بن جائے گی
میں نے کل بزم میں ناگاہ اُسے دیکھا تھا

وصل کی رات ستاروں نے بڑی حسرت سے
گاہ دیکھا تھا مجھے گاہ اُسے دیکھا تھا

لوگ اُسے ڈھونڈنے نکلے تو یہ معلوم ہُوا
جس نے دیکھا تھا سرِ راہ اُسے دیکھا تھا

آج اِک عمر کے بعد اُس سے ملا تھا لیکن
اپنے احوال سے آگاہ اُسے دیکھا تھا

اُس کا کیا ٹھیک کہ لوگوں نے بیک وقت جمالؔ
سرِ میخانہ و درگاہ اُسے دیکھا تھا

باسم

کوئی موضوع ہو، تیرا حوالہ اچھا لگتا ہے
پھر اُس کے بعد بہ چُپ رہنے والا اچھا لگتا ہے

اِک ایسی بے نتیجہ جنگ لڑ کر آ رہا ہوں میں
کہ اب شمشیر سے بڑھ کر پیالہ اچھا لگتا ہے

بہت آرائشِ خانہ کے منصوبے بناتا ہوں
مگر کمرے کی چھت پر ایک جالا اچھا لگتا ہے

متفرق شعر

مجھے اچھا نہیں لگتا، زباں کو بند کر لینا
مگر بچّوں کے ہاتھوں میں نوالہ اچھا لگتا ہے

کبھی دل شاد رہتا ہے کسی کے ملتے رہنے سے
کبھی کوئی بچھڑ کر جانے والا اچھا لگتا ہے

عناصر سے الگ کر کے میں تجھ کو دیکھنا چاہوں
ترے ہمراہ سب کچھ لامحالہ اچھا لگتا ہے

اِسی اِک بات پر ہے اتّفاق و اختلاف اُس سے
اُسے آئینہ اور مجھ کو پیالہ اچھا لگتا ہے

وہ کوئی اور ہے، ہم میں سے ہرگز ہو نہیں سکتا
جسے اِس گھر سے باہر کا اُجالا اچھا لگتا ہے

اُس کی محبّتوں کا طریقہ کچھ اور ہے
کہتا وہ مجھ سے اور ہے کرتا کچھ اور ہے

جو اُس پہ بیتتی ہے وہ معلوم ہے مجھے
جب اُس سے پُوچھتا ہوں بتاتا کچھ اور ہے

وہ بھی سمجھتا ہے کہ جُدا کیوں ہوئے ہیں ہم
یہ مَیں بھی جانتا ہوں کہ قصّہ کچھ اور ہے

پنچوں کی بات مان لیں کس طرح ہم کہ جب
میرے اور اُس کے درمیاں جھگڑا کچھ اور ہے

اُس کے بغیر چین بھی پڑتا نہیں جسے
سمجھاتا اور کچھ ہوں سمجھتا کچھ اور ہے

کر اے غزالِ عشق مرے شہرِ دل کی سیر
صحراؤں میں غبار اُڑانا کچھ اور ہے

یاروں سے ملتے جُلتے رہا کیجیے جمالؔ
یاروں کے بیچ اِن دنوں چرچا کچھ اور ہے

اِس سمے کوئی نہیں میری نگہبانی پر
یہ گھڑی سخت کڑی ہے ترے زندانی پر

باخبر کر کے رہِ عشق کی مشکل سے تجھے
فیصلہ چھوڑ دیا ہے تری آسانی پر

نہ ہوا اور نہ مٹّی پہ کبھی ہو پایا
جو بھروسا ہے مجھے بہتے ہوئے پانی پر

ــــــــ

میں ابھی پہلے خسارے سے نہیں نکلا ہوں
پھر بھی تیار ہے دل دُوسری نادانی پر

کسی بھی وقت بدل سکتا ہے لمحہ کوئی
اِس قدر خوش بھی نہ ہو میری پریشانی پر

ختم ہونے کو ہیں اشکوں کے ذخیرے بھی جمالؔ
روئے کب تک کوئی اِس شہر کی ویرانی پر

یہ بات احاطۂ اہلِ ہوس سے باہر ہے
یہاں وُہی ہے کہ جو دسترس سے باہر ہے

اِسی کا نام ہے دُنیا کہ یاں کسی کے کبھی
نہ اختیار میں کچھ ہے نہ بس سے باہر ہے

دُرست ہے کہ میں ناکام وصل ہوں تیرا
مگر یہ بات ترے پیش و پس سے باہر ہے

کسی کو اُس کی رہائی کا غم نہیں ورنہ
رہا تو وہ بھی نہیں جو قفس سے باہر ہے

زمینِ پاک تری بُو ئے خاک سے نمناک
کوئی ترے لیے کتنے برس سے باہر ہے

یہ سوچ کے ہر صبح نکل پڑتے ہیں گھر سے
سر آئے ہمارے کوئی الزام کم از کم

منش

اِس بار تو غرورِ ہُنر بھی نکل گیا
بچ کر دہ مجھ سے بارِ دگر بھی نکل گیا

اِتنا ترا وصال تو چاہا نہ تھا کبھی
دل سے تری جُدائی کا ڈر بھی نکل گیا

ہم راہ کے تعیّنِ جاں کاہ میں رہے
اِس کشمکش میں وقتِ سفر بھی نکل گیا

بکشش

مقصود صرف ڈھونڈنا کب تھا تجھے سو میں
جس سمت تو نہیں تھا اُدھر بھی نکل گیا

کہتا نہ تھا میانہ روی ہے بُری جمال
صحرا کے ساتھ، ہاتھ سے گھر بھی نکل گیا

بڑا عذاب ہے، ہونٹوں پہ بات آئی ہوئی
اِدھر زبان سے نکلی اُدھر پرائی ہوئی

دل میں یادِ رفتگاں آباد ہے
ورنہ یہ دل بھی کہاں آباد ہے

ایک میں آباد ہوں اِس شہر میں
اور اِک میرا مکاں آباد ہے

کِس کے یہ نقشِ قدم ہیں خاک پر
کون ایسے میں یہاں آباد ہے

بابِ عمرِ رائگاں کی لوح پر
حرفِ احساسِ زیاں آباد ہے

میرے ہونے سے نہ ہونا ہے مرا
آگ جلنے سے دھواں آباد ہے

رونقِ دل کا ہے عالم دیدنی
خانۂ آوارگاں آباد ہے

اِک دریچہ اُس گلی میں آج تک
بے چراغ و بے نشاں آباد ہے

جب اپنی رُوح کے احوال میں شامل نہیں سمجھا
تعلق توڑنے کے بھی اُسے قابل نہیں سمجھا

عجب دَر تھا نہ کُھلنے پر بھی اُس کا فیض جاری تھا
عجب خیرات تھی جس کو کوئی سائل نہیں سمجھا

سبھی سمجھے مجھے اُس سے جُدا ہونے کی جلدی تھی
کوئی بھی دیکھنے والا مری مُشکل نہیں سمجھا

محبت کے سوا بھی ہیں بہت سے مسئلے اُس کے
دماغ اِس بات کو سمجھا ہے لیکن دِل نہیں سمجھا

کبھی اِس آسماں کی دلکشی میں گُم نہیں ہوتا
کبھی سوئے ہوئے دُشمن کو مَیں غافِل نہیں سمجھا

مچل گیا تھا یہ دل دیکھ کر اُسے سرِ راہ
سو میں بھی آگیا باتوں میں اِس کمینے کی

جمش

خود اُس نے تعلق ہی کوئی جب نہیں رکھا
پھر میں نے بھی اُس شخص سے مطلب نہیں رکھا

ہر عُہدہ، ہوا پیش مگر عشق میں، ہم نے
جُز دَربدَری کوئی بھی منصب نہیں رکھا

رُخصت کی اجازت نہ مِلی اُس سے وگرنہ
سامان کو باندھے ہوئے میں کب نہیں رکھا

ششش

دل میں نہ تری یاد کو کس روز سجایا
آنکھوں میں ترے خواب کو کس شب نہیں رکھا

اُس نے بھی بہت ڈھونگ رچائے تھے وفا کے
میں نے بھی اُٹھا کر کوئی کرتب نہیں رکھا

کب عشق میں، ہم لمحۂ کمزور سے گزرے
کب پیش ترے خود کو مودّب نہیں رکھا

خود نہر نکالی ہے تو پھر پیاس بجھائی
بہتی ہوئی گنگا پہ کبھی لب نہیں رکھا

کچھ باپ کا سایہ بھی بہت جلد اُٹھا تھا
کچھ گردشِ دوراں نے مہذّب نہیں رکھا

میں جو کل پیرہنِ خاک بدل کر آیا
وہ بھی ملنے نئی پوشاک بدل کر آیا

اے زمیں زاد تری رفعتیں چھونے کے لیے
تجھ تلک میں کئی افلاک بدل کر آیا

اُس کو راس آئی ہے یہ بزمِ جہاں، جو بھی یہاں
اپنا پیمانۂ ادراک بدل کر آیا

عشق میں کوئی تکلف کی ضرورت تو نہیں
پھر وہ کیوں دیدۂ نمناک بدل کر آیا

ہم سے کر بے سر و سامانیِ ہجرت پہ سوال
اُس سے مت پُوچھ جو املاک بدل کر آیا

بے سبب تو نہ رہا عرصۂ دُنیا میں قیام
میں مزاجِ خس و خاشاک بدل کر آیا

اُس آنکھ کی تحویل میں رہتے ہیں ہمیشہ
ہم خواہشِ تکمیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

کیسے ہیں بھلا یہ ترے عشّاقِ ہمہ وقت
فکرِ غمِ تعطیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

اِس خاک پہ میں اور سرِ افلاک ستارے
اِک حُکم کی تعمیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

خود کو نہ ہو محسوس، پہ چہرے کے خط و خال
اِک عالمِ تبدیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

کوئی سا بھی موسم ہو سرِ چشمِ محبت
کچھ عکس مگر جھیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

مُبہم مجھے رہنے دے کہ ابلاغ کے جھگڑے
اظہار کی تفصیل میں رہتے ہیں ہمیشہ

اپنے ہمراہ جلا رکھا ہے
طاقِ دل پر جو دیا رکھا ہے

جُنبشِ لب نہ سہی تیرے خلاف
ہاتھ تو ہم نے اُٹھا رکھا ہے

تُو مجھے چھوڑ کے جا سکتا نہیں
چھوڑ اس بات میں کیا رکھا ہے

وہ ملا دے گا ہمیں بھی جس نے
آب اور گل کو ملا رکھا ہے

مجھ کو معلوم ہے میری خاطر
کہیں اِک جال بُنا رکھا ہے

جانتا ہوں مرے قصّہ گو نے
اصل قِصّے کو چُھپا رکھا ہے

رات نے اپنی گواہی کے لیے
اِک ستارے کو بچا رکھا ہے

کام کچھ اتنے ہیں کرنے کو جمالؔ
نام کو کل پہ اُٹھا رکھا ہے

اِس رمز پر وہ آئینہ شرمندہ تھا مرا
میں مر چکا تھا عکس مگر زندہ تھا مرا

ترتیب دینا ہوں گی پھر اپنی صفیں مجھے
دُشمن سے جا ملا جو نمائندہ تھا مرا

بے قیمتی کا رنج نہیں سانحہ یہ ہے
اب کے مرا غُلام فروشندہ تھا مرا

مَیں نے اُس شخص کی یاری کو ضروری جانا
اُس نے بس وقت گزاری کو ضروری جانا

مَیں نے اُس حُسن کی تفصیل سے پرہیز کیا
اُس نے مضمون نگاری کو ضروری جانا

مر رہا تھا مرا دُشمن سو اُسی دم مَیں نے
آخری ضربتِ کاری کو ضروری جانا

زنجیر ہلانے کی اجازت نہیں ملتی
یُوں تو درِ انصاف کو عزّت نہیں ملتی

اقرار نہ کرنا بھی بہت ہے کہ ہمیں تو
انکار بھی کرنے کی سہولت نہیں ملتی

محنت سے پسینے کو محبّت میں بہاؤں
اور اِس پہ بھی اِتراؤں کہ اُجرت نہیں ملتی

جھوٹوں کے بہت کارِ محبّت میں مزے ہیں
میں سچ ہوں جبھی مجھ کو رعایت نہیں ملتی

یہ بات بُری ہے مگر آباد گھروں سے
ہم خانہ خرابوں کی طبیعت نہیں ملتی

جلتے ہوئے ہر دیپ میں روشن ہے مرا عکس
تجھ میں ترے ہونے کی علامت نہیں ملتی

مصروف رکھا مجھ کو سدا عشق نے تیرے
دیکھوں مَیں تری سمت یہ فرصت نہیں ملتی

آمادہ نہیں جاں سے گزرنے پہ سرِ عشق
ایسا بھی نہیں ہے کہ روایت نہیں ملتی

خود پر سے بھروسا ہی جمالؔ اُٹھنے لگا ہے
کوئی بھی مرے حق میں شہادت نہیں ملتی

دیدنی ہوگا سرِ جنگ دروبست مرا
تازہ دم میں بھی ہوں دُشمن بھی زبردست مرا

کچھ تو گہنایا ہوا ہے مری تدبیر کا چاند
کچھ ہے گردش میں ستارہ بھی سیر دست مرا

میرے ہاتھوں میں تری موت بھی ہے زیست بھی ہے
تیری گردن میں ابھی تیر ہے پیوست مرا

مسئلہ اپنی بقا کا بھی تھا درپیش اُسے
فیصلہ کرنا پڑا اُس کو بہ یک جست مرا

گرمیِ خوں گئی ہتھیار ترے پھینکنے سے
حوصلہ تجھ کو ہرانے سے ہوا پست مرا

مجھ کو سائے کی نہیں تیری طلب ہے میرے دوست
دیکھ کتنی دُور بیٹھا ہوں تری دیوار سے

سب لوگ سمجھتے ہیں ستم گر کے علاوہ
کچھ اور ٹھکانے بھی ہیں اِس گھر کے علاوہ

یہ بات ترے عشق نے سمجھائی کہ دُنیا
کچھ اور ہے محرُوم و میسّر کے علاوہ

کِس طرح مورّخ کا قلم اُن کو لکھے گا
جو رنج ہیں پسپائیِ لشکر کے علاوہ

بے چینی ہے جو سرحدِ افلاک و زمیں پر
کچھ اور بھی جھگڑے ہیں سمندر کے علاوہ

اِک یاد بھی ہمراہ سفر میں ہے ہمارے
آنکھوں سے بچھڑتے ہوئے منظر کے علاوہ

کیا دُکھ ہے جمالؔ آپ کو پُوچھا نہ کسی نے
ملتے ہی نہیں اب تو کہیں گھر کے علاوہ

سبھی کھڑے تھے شریکِ زمانہ ہوتے ہوئے
کسی نے روکا نہ گھر سے روانہ ہوتے ہوئے

چراغ بُجھتے چلے جا رہے ہیں سلسلہ وار
مَیں خود کو دیکھ رہا ہوں فسانہ ہوتے ہوئے

اچانک ایک ستارہ فلک سے ٹُوٹ گیا
مرے بھی شاملِ بزمِ شبانہ ہوتے ہوئے

مرا ہمیشہ اُن الفاظ پر یقین رہا
جو مُنکشف ہُوئے لب سے ادا نہ ہوتے ہوئے

اِسی طرح کے ہیں جتنے بھی دُکھ ہمارے ہیں
سروں پہ چھاؤں نہیں شامیانہ ہوتے ہوئے

مرا بھی نام ہے فہرستِ مُجرماں میں لِکھا
مَیں دیکھتا رہا خالی خزانہ ہوتے ہوئے

پرند لَوٹ کے آنے ہی پر نہیں راضی
کوئی تو بات ہے جو آشیانہ ہوتے ہوئے

عجب وہ لوگ تھے آزار بھی عجب اُن کے
زمین چھوڑ گئے آب و دانہ ہوتے ہوئے

یہاں تو خستگیٔ بام و در پہ چُپ ہیں سبھی
کوئی تڑپتا ہے بیرونِ خانہ ہوتے ہوئے

مرا کمال کہ میں اِس فضا میں زندہ ہوں
دُعا نہ ملتے ہوئے اور ہوا نہ ہوتے ہوئے

حریف تھا مرے دُشمن کا وہ مگر میں نے
جمال کی نہیں بیعت، بہانہ ہوتے ہوئے

عجیب بھول بھلیّوں کے درمیاں آئی
وہ ایک یاد کہ بے نام و بے نشاں آئی

جہاں جہاں نہیں پہنچا غبارِ راہ ترا
وہاں وہاں یہ زمیں زیرِ آسماں آئی

ہمراہ تیرے منصب و لشکر ضرور ہے
لیکن شکست تیرا مقدّر ضرور ہے

گردش میں آج میرے ستارے ہیں گر تو کیا
تیرا بھی ایک وقت مقرّر ضرور ہے

کیا ہے، یہ مجھ کو علم نہیں ہو سکا ابھی
کچھ ہے کہ جو بساط سے باہر ضرور ہے

پھر کوئی ملال ہی غلط ہے
جب صُورتِ حال ہی غلط ہے

یہ گھر ہے اگر تو ایسے گھر میں
رہنے کا خیال ہی غلط ہے

اِس عالمِ خاک میں کسی کی
دراصل مثال ہی غلط ہے

یا واقعی بے نیاز ہے وہ
یا دستِ سوال ہی غلط ہے

کیا تجھ سے گلہ کریں کہ تیرا
آئینِ وصال ہی غلط ہے

اِک تیرا ہی واقعہ نہیں کچھ
مجھ پر تو یہ سال ہی غلط ہے

اِس میرے مکاں کی داستاں کا
بُنیادی خیال ہی غلط ہے

نیّت نہ تھی سفر کی، ہوا بھی خلاف تھی
مجبور تھے کہ گھر کی فضا بھی خلاف تھی

مَیں پھر بھی جسم ہی میں رہا جب تلک رہا
موسم کے ساتھ ساتھ قبا بھی خلاف تھی

مُنصِف کا فیصلہ تھا محلِّ نظر مگر
چُپ ہو گیا کہ خلقِ خُدا بھی خلاف تھی

اندر بھی اُٹھ رہا تھا ہر اِک دستِ اختلاف
باہر سے آنے والی صدا بھی خلاف تھی

اِس خاکداں میں پھر بھی رہا کرّ و فر کے ساتھ
خالی تھی جو یہاں وہ جگہ بھی خلاف تھی

کُچھ بادِ انتقام تھی زوروں پہ اور کُچھ
تقدیر ہر لباس و ردا بھی خلاف تھی

جب شہر چھوڑ کر مجھے جانا پڑا جمالؔ
اُس شب فضائے دشتِ بلا بھی خلاف تھی

خُدا ہی آپ نہ جب تک زمیں پہ اُترے گا
تو کون پُورا کِسی کے یقیں پہ اُترے گا

یہ سیلِ اشک بھی اپنا ہے آنکھ بھی اپنی
کھڑے رہو کہ یہ دریا یہیں پہ اُترے گا

مری نگاہ سمجھ میرے پیرہن پہ نہ جا
مکاں کا رنگ ہے یہ تو مکیں پہ اُترے گا

بھروسا کوئی نہیں ہے کسی مُسافر کا
جہاں بھی ریل رُکے گی وہیں پہ اُترے گا

چلے تو ہو سفرِ عشق پر خیال رہے
کہیں چڑھے گا یہ دریا کہیں پہ اُترے گا

غرُوب ہونے سے پہلے ستارۂ سحری
کسی کے صحن کسی کی جبیں پہ اُترے گا

ہجومِ کم نظراں کر رہا ہے پھر تائید
عذاب پھر کسی گوشہ نشیں پہ اُترے گا

تمام خاک نشیں زیرِ خاک ہوں گے مگر
لہو کا رنگ تری آستیں پہ اُترے گا

یہاں بھرے ہوئے بیٹھے ہیں سب بندھے ہاتھوں
سواب یہ غصّہ ترے جانشیں پہ اُترے گا

جمالِ خطۂ دل ہو بھی جائے گر ہموار
کوئی جہاز نہ اس سرزمیں پہ اُترے گا

ہار جانے پہ لوگ کہتے ہیں
کون جھگڑا کرے مقدر سے

کیا اور سزا دے گا زیادہ سے زیادہ
وہ مجھ کو بھلا دے گا زیادہ سے زیادہ

اِس آتشِ فرقت کے مقدر میں ہے بجھنا
کتنی وہ ہوا دے گا زیادہ سے زیادہ

رونا تو حضور اُس کے ہی رونا کہ وہ آنسو
مٹی میں مِلا دے گا زیادہ سے زیادہ

رات آتی رہتی ہے دن نکلتا رہتا ہے
اور خُدا کے بندوں کا کام چلتا رہتا ہے

پھر رہا ہوں بستی میں یہ پتا لیے کب سے
اِک چراغ اُس گھر میں دن کو جلتا رہتا ہے

ایک گھر ہے میں جس میں رہتا ہوں خوش و خرّم
ایک بات ہے جس سے دل دہلتا رہتا ہے

میں بھی آسمانوں میں روز اضافہ کرتا ہوں
وہ بھی اِن زمینوں کا رُخ بدلتا رہتا ہے

زیست کی تمازت میں شاخِ مرگ سے آگے
راہرو ٹھہرتا ہے رستہ چلتا رہتا ہے

عشق کرنے والوں کو صرف یہ سہولت ہے
کچھ نہ کرنے سے بھی کچھ دل بہلتا رہتا ہے

میں بساطِ دُنیا کو جب لپیٹ دیتا ہوں
کوئی دُوسرا مجھ میں گھر بدلتا رہتا ہے

خُدا نے خوش مجھے اوقات سے زیادہ کیا
کہ ہاتھ تنگ رکھا اور دل کُشادہ کیا

مُحیط چاروں طرف ایک اسم ہے جس نے
نظر میں رنگ بھرے آئنے کو سادہ کیا

کبھی فلک کبھی دھرتی نے دی پناہ مجھے
کبھی خُدا سے کبھی خود سے استفادہ کیا

ازل سے اُس کا گرفتارِ عشق ہوں جس نے
دیے کو روشنی میں چاند سے زیادہ کیا

بس ایک سطحِ یقیں پر رہے ہمیشہ ہم
نہ میں نے عرض کبھی کی نہ اُس نے وعدہ کیا

ترا کرم کہ کوئی کام آ پڑا اُس دم
میں جب کبھی ترے انکار کا ارادہ کیا

مرے خُدا نے مرا رزق مجھ کو پہنچایا
جمالؔ گھر سے نکلنے کا جب ارادہ کیا

اُنھی کے واسطے بزمِ جہاں سجائی گئی
دیا جلایا گیا اور ہوا چلائی گئی

اُنھی کے نام پہ باران و خاک جمع ہوئے
شجر اُگائے گئے شاخِ گُل سجائی گئی

اُنھی کے چلنے کو یہ آسماں بنایا گیا
اُنھی کے بیٹھنے کو یہ زمیں بچھائی گئی

اُنھوں نے رُوح کو دوڑا دیا ہر اک شے میں
یہ کائنات جب اُن کے حضور لائی گئی

کمال ہے یہ اُسی اِسم کا کہ آج تلک
نہ تابِ خامہ نہ تاثیرِ روشنائی گئی

وہ شہر دیکھ تو آیا مگر یہ سوچتا ہوں
یہ مَیں گیا تھا کہ میری شکستہ پائی گئی

دلِ سیاہ سے لے کر دماغ کی حد تک
جہاں بھی آپ گئے ہیں وہاں خُدائی گئی

نگاہ ڈالی گئی اِس جہانِ خستہ پر
جمالِ عزتِ کون و مکاں بڑھائی گئی

شاہِ زماں کا تذکرہ کرنے کا وقت ہے
یہ وقت ہی تو جاں سے گزرنے کا وقت ہے

گھر سے مسافروں کے نکلنے کی ہے گھڑی
راہوں میں خوشبوؤں کے بکھرنے کا وقت ہے

اِس وقت ایک دھیان ہے اور اُن کا دھیان ہے
یہ وقت دل کو آئینہ کرنے کا وقت ہے

اے راہِ شوق مجھ کو پہنچنے کی ہے لگن
چلنے کا وقت ہے نہ ٹھہرنے کا وقت ہے

وہ وقت ہے اذان میں اُس نام کے لیے
تصویر میں جو رنگ کے بھرنے کا وقت ہے

باشندگانِ ارضِ وطن پر جمال اب
اللہ کے رسولؐ سے ڈرنے کا وقت ہے

سبزے سے کچھ لگاؤ نہ سوسن سے عشق ہے
آوارہ خاطری کو نشیمن سے عشق ہے

ہے چشمِ انتظار کی رونے سے برکتیں
اِس دشت کے خمیر میں ساون سے عشق ہے

پُوچھا تھا چارہ ساز نے عُمرِ مرض ہے کیا
تیماردار بولے کہ بچپن سے عشق ہے

تیرے ہجوم سینہ فگاراں میں پیش پیش
وہ بھی تو ہیں جنھیں ترے دشمن سے عشق ہے

کس پر تری نگاہ پڑی کس پہ لب ہلے
یہ اُن کا غم نہیں جنھیں درشن سے عشق ہے

دل کا یہ کہہ کے اُس سے تعارف کرایا میں
یہ شہر کا مکین ہے اور بَن سے عشق ہے

اُس کو نہیں ہے کام چراغ و ستارہ سے
جس آنکھ کو ترے رُخِ روشن سے عشق ہے

معمارِ شہرِ نو کو غرض کیا کہ سوچتا
کس گھر بسے گا وہ جسے آنگن سے عشق ہے

ہر رہروِ سخن کو مُخاطب نہ کر جمال!
اُن سے کلام کر کہ جنھیں فن سے عشق ہے

روزِ ازل سے خوگرِ سیلابِ گریہ ہے
شہرِ شکستہ دل کہ لبِ آبِ گریہ ہے

کیا اُس پر التفات جو بیتابِ گریہ ہے
یہ دیکھ کون واقفِ آدابِ گریہ ہے

ہو تیرا حُسن یک دو نفس یا مرا چراغ
جو کچھ بھی اس جگہ ہے وہ اسبابِ گریہ ہے

دامانِ عشق میں ہیں ثمر ہائے وصل و ہجر
یہ کشتِ جیب و آستیں شاداب گریہ ہے

عالم وہ عشق میں ہے کہ معلوم ہی نہیں
تعبیرِ گریہ ہے کہ مجھے خوابِ گریہ ہے

قدموں میں تیرے چادرِ خورشید ہے تو کیا
بالائے سر ہمارے بھی مہتابِ گریہ ہے

بجھتا نہیں جو اشک فروزاں ہوا ایک بار
وہ آنکھ ہر لحاظ سے محرابِ گریہ ہے

آئے گی غم میں نیند کی اِک لہر بھی مگر
پلکیں نہیں جھپکنا کہ یہ بابِ گریہ ہے

یہ راز اُس کے بوسۂ لب سے کھلا جمال
رُخسار و چشم کیا ہیں تب و تابِ گریہ ہے

دُنیا میں وُہی کچھ ہے مری کارگزاری
جو عمر سرِ کوچۂ دلدار گزاری

ہم کو بھی شرف بخش کبھی دربدری کا
اُس آنکھ سے یہ عرض کئی بار گزاری

دل وار دیا اُس کے در و بام پہ ہیں نے
جاں نذر سرِ سایۂ دیوار گزاری

گو ٹوٹ گئے سارے تعلق، پہ ہے باقی
اُس شخص سے اِک رشتۂ اظہار گزاری

آج اُس سے ملے ہیں تو یہ محسوس ہوا ہے
جتنی بھی گزاری ہے وہ بے کار گزاری

خود ہی سے کبھی ہار، کبھی جیت گیا میں
خود ہی سے سدا برسرِ پیکار گزاری

ہر آن مَیں مصروفِ محبت رہا لیکن
لکھی ہی نہیں اُس نے مری کار گزاری

اِس دل کی زمیں سیرگہِ عشق ہے ایسی
تعطیل یہاں اُس نے کئی بار گزاری

سب پھول ترے زخم ہمارے ہیں کم و بیش
افلاک پہ جتنے بھی ستارے ہیں کم و بیش

اِک تیرے تغافل کو خُدا رکھے وگرنہ
دُنیا میں خسارے ہی خسارے ہیں کم و بیش

وہ جس جگہ مارے گئے اجداد ہمارے
ہم بھی اُسی دریا کے کنارے ہیں کم و بیش

موسم کی گھٹن ہو کہ زمانے کا چلن ہو
سب تیرے بچھڑنے کے اشارے ہیں کم و بیش

یہ آنکھیں اگر ہیں تو بہت کم ہیں یہ آنکھیں
ہر سمت یہاں تیرے نظارے ہیں کم و بیش

سب عشق میں اندازے غلط نکلے ہمارے
جو شرط لگائی ہے وہ ہارے ہیں کم و بیش

اُس گھر کی فضا نے مجھے مانا نہیں اب تک
پینتیس برس جس میں گزارے ہیں کم و بیش

سویرا ہو بھی چکا اور رات باقی ہے
ضرور دل میں ابھی کوئی بات باقی ہے

یہ لوگ کس قدر آرام سے ہیں بیٹھے ہوئے
اگرچہ ہونے کو اک واردات باقی ہے

کچھ اور زخم محبت میں بڑھ گئی ہے کسک
یہ سوچ کر کہ ابھی تو حیات باقی ہے

یہ غم جُدا ہے بہت جلد باز تھے ہم تم
یہ دُکھ الگ ہے ابھی کائنات باقی ہے

جو میری تیری مُلاقات کا سبب تھا کبھی
وہ لمحہ تیرے بچھڑنے کے ساتھ باقی ہے

تمام بیڑیاں تو کاٹ ڈالی ہیں لیکن
جمالؔ قیدِ نفس سے نجات باقی ہے

ہر چند آنکھ تھی سرِ منظر لگی ہوئی
کیا بولتا کہ مُہر تھی لب پر لگی ہوئی

اُس کی تپش نے اور بھی سُلگا رکھا ہے کچھ
جو آگ ہے مکان سے باہر لگی ہوئی

سُنتے ہیں اُس نے ڈھونڈ لیا اور کوئی گھر
اب تک جو آنکھ تھی ترے در پر لگی ہوئی

پہچان کی نہیں ہے یہ عرفان کی ہے بات
تختی کوئی نہیں مرے گھر پر لگی ہوئی

کیسے قرار ہو کہ سوالوں کی ایک بھیڑ
مدت سے شہرِ دل کے ہے اندر لگی ہوئی

اب کے بہار آنے کے امکان ہیں کہ ہے
ہر پیرہن پہ چشمِ رفوگر لگی ہوئی

اِس بار طُول کھینچ گئی جنگ اگر تو کیا
اس بار شرط بھی تو ہے بڑھ کر لگی ہوئی

منحوس ایک شکل ہے جس سے نہیں فرار
پرچھائیں کی طرح سے برابر لگی ہوئی

کبھی جو دُور کا منظر بُلانے لگتا ہے
وہیں پہ مجھ کو مرا گھر بُلانے لگتا ہے

درونِ ذات جب اک اسم کھینچتا ہے مجھے
وہ کون ہے کہ جو باہر بُلانے لگتا ہے

کبھی دریچے میں روشن کرے ستارے کو
کبھی وہ شمع بُجھا کر بُلانے لگتا ہے

وہ آنکھ چُپ ہے ہمیشہ سے پھر بھی لگتا ہے
کہ جیسے اب سُخن آغاز کرنے والی ہے

ہوائے شام کہ کرتی تھی اجتناب بہت
سُنا ہے اب مجھے ہمراز کرنے والی ہے

جو ایک نہر گُزرتی ہے شہرِ دل سے جمالؔ
کبھی وہ خوش، کبھی ناراض کرنے والی ہے

وفورِ کیف سے سُن ہو گئے تھے ہاتھ مرے
کہ اُس کے عارض و لب کا سفر ہی ایسا تھا

اُس بزم میں دل پہلو بدلتا ہے تو بدلے
دریا سے کوئی پیاسا نکلتا ہے تو نکلے

پلکیں ہیں کسی خواب کے انبار سے بوجھل
وہ اب بھی اگر بوجھ بدلتا ہے تو بدلے

ہے عشق گر اُس سے تو یہ لازم ہے کہ عاشق
جلتا ہے تو جل جائے پگھلتا ہے تو پگھلے

کمروں میں پڑے نیند کے ماتوں کو غرض کیا
شب بھر کوئی آنگن میں ٹہلتا ہے تو ٹہلے

مَیں ترک کیا رات کو اب گھر سے نکلنا
مہتاب مرے راز اُگلتا ہے تو اُگلے

کیوں جُرم ہے احوال محبّت کا سُنانا
اچھّا ہے اگر کوئی سنبھلتا ہے تو سنبھلے

یہ تیرا رویّہ ہے کہ ہم سوچ رہے ہیں
دل تیرے علاوہ بھی بہلتا ہے تو بہلے

اپنائے ہیں مَیں نے بھی عجب طور طریقے
وہ بھی نئی پوشاک بدلتا ہے تو بدلے

نہ حال پُوچھتا ہے اور نہ کام پُوچھتا ہے
یہ عشق اپنے مریضوں کا نام پُوچھتا ہے

وہ روز ڈھاتا ہے اِک گوشۂ عمارتِ دل
اور آپ ہی سببِ انہدام پُوچھتا ہے

میں یُوں بتاتا ہوں تفصیلِ انتشار اُسے
کہ جیسے وہ زرہِ انتظام پُوچھتا ہے

بہ مکر کرتا ہے پھر بھاؤ تاؤ مجھ سے مرا
وہ پہلے ساری دُکانوں سے دام پُوچھتا ہے

سفر کا اذن بھی دیتا نہیں کسی صورت۔
اگر نہ جاؤ تو وجہِ قیام پُوچھتا ہے

وہ اپنے رنج بھلا کیوں مجھے بتانے لگا
جو میرا حال بمشکل تمام پُوچھتا ہے

جواز رکھتا ہوں میں اِس گلی میں ہونے کا
کوئی مجھے پسِ دیوار و بام پُوچھتا ہے

شریک ہے وہ کسی دُوسرے کی سانسوں میں
مگر یہ دل کہ اُسے صبح و شام پُوچھتا ہے

صرف اُس کی رفاقت مجھے کافی بھی نہیں تھی
یہ ایسی کوئی وعدہ خلافی بھی نہیں تھی

کیوں روکتا غیبت سے میں احبابِ سُخن کو
یہ بات طبیعت کے منافی بھی نہیں تھی

صف میں وہ نُمایاں نظر آیا مجھے سب سے
گو اُس میں کوئی بات اضافی بھی نہیں تھی

لکھتے تھے غزل اُس کو سُنانے کے لیے جب
یہ فکرِ مضامین و قوافی بھی نہیں تھی

افشا نہ کیا، اُس نے کِسی راز کو میرے
ہر چند کہ وہ آنکھ غلافی بھی نہیں تھی

علامتیں بہت سی ہیں نشانیاں بہت سی ہیں
ترے نہ ہونے کی مگر کہانیاں بہت سی ہیں

شکوے میں کبھی اور نہ فریاد میں رکھّا
اِس دل کو فقط ہم نے تری یاد میں رکھّا

کیا اپنا بھروسا ہے کہ اُس آنکھ نے ہم کو
ہر وقت نئے عالمِ ایجاد میں رکھّا

کیوں دل پہ توجّہ کہ چلے جانے سے تیرے
کیا رہ گیا اِس خانۂ برباد میں رکھّا

اِک خُوبی اضافی رکھی تعمیر میں اُس نے
اِک نقص مرے شہر کی بُنیاد میں رکھّا

اللہ نے ہُنر خوب دِیے ہیں مجھے پھر بھی
جو مجھ سے بچا وہ مری اولاد میں رکھّا

شکستگی میں جو گھر خواب سے زیادہ ہے
مجھے ستارہ و مہتاب سے زیادہ ہے

صدق چلتا ہے کوئی اور نہ ہُنر چلتا ہے
شہرِ بے حس ہے یہاں کارِ دگر چلتا ہے

کوئی رُک جاتا ہے اور کوئی بشر چلتا ہے
یہ مری جان سرِ راہگزر چلتا ہے

ناؤ سے پُوچھتا ہے، کیا ہُوا ملّاح ترا
ایک دریا کہ پسِ دیدۂ تر چلتا ہے

کون چوپال میں سُنتا ہے جو گزرے دل پر
اِس جگہ داستاں گوئی کا ہُنر چلتا ہے

وہ ہر اِک کھیل میں کچھ مُہرے بدل لیتا ہے
اور پھر چال بہ اندازِ دگر چلتا ہے

پسِ دیوار بہت کی تری کردار کُشی
سرِ بازار ترا سکّہ مگر چلتا ہے

کام تو کیا کہ ترے نام پہ قدغن ہے یہاں
تذکرہ پھر بھی ترا شام و سحر چلتا ہے

کِسی کے نام پہ خیرات چلی آتی ہے
مُجھ کو معلُوم ہے جس طرح یہ گھر چلتا ہے

خواب کیا تھا مرا، تعبیر مجھے کیا دی ہے
ایک زنجیر سے لپٹی ہوئی آزادی ہے

ایسی آتش سے ہم آغوش ہوا ہوں جس سے
جسم مانوس ہے پر رُوح کہاں عادی ہے

اُس نے کشکول بڑھا کر کوئی سرگوشی کی
میں نے آواز لگائی ترا فریادی ہے

چھوڑ بھی سکتا ہوں اور قتل بھی کر سکتا ہوں
پر اُسے بھولنے کا مسئلہ بُنیادی ہے

لڑکھڑایا تو صدا دے کے سنبھالا اُس نے
دل بھلا اتنی محبت کا کہاں عادی ہے

ہے تری یاد مرے دل کی گزرگاہوں میں
یا کوئی راستہ بھولی ہوئی شہزادی ہے

ہر قدم پر کوئی قدغن ہے قفس سے باہر
قید میں حلقۂ زنجیر کی آزادی ہے

اُس سے پھر ملنے کا امکان بھی رکھا ہے جمالؔ
خشتِ بوسیدہ بھی دیوار میں چُنوا دی ہے

وہ صُبحِ وصل کر کے پریشان بھی گیا
لیکن ردائے وعدۂ شب تان بھی گیا

اک بار میں سفارشِ اشک و دُعا کے بعد
اُس اُنجمن میں بے سر و سامان بھی گیا

رُخصت ہُوا ہے دل سے تمھارا خیال بھی
اِس گھر سے آج آخری مہمان بھی گیا

ایسا کہاں وہ ماننے والا تھا میری بات
بادل اُمڈ کے آئے ہیں تو مان بھی گیا

بہکا رہا ہے کون مجھے یُوں ترے خلاف
اِک مرتبہ خود اپنی طرف دھیان بھی گیا

کیا کر سکے گا شہر کہ مرنے سے پیشتر
گر اپنے قاتلوں کو مَیں پہچان بھی گیا

دُشمن کے دل میں اب بھی ہے دہشت مری جمالؔ
ہر چند میرے ہاتھ سے میدان بھی گیا

جمال اپنے سفر کا خود ستارہ

ریاض احمد شاد

ریاض احمد شاد صاحب سے میری شناسائی کا عرصہ آپ کو اُن کی اِس تحریر سے معلوم ہو جائے گا۔ اس مضمون کو ان صفحات کی زینت بنانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ یہ مُجھ پر واحد مضمون ہے جو غیر مطبوعہ ہے (میرے علم کے مُطابق)۔ اس کے غیر مطبوعہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ مضمون نگار نے سرگودھا کی ایک تقریب میں یہ مضمون پڑھ کر میرے حوالے کر دیا تھا کہ کہیں شائع کروا دوں (اُن کا خیال تھا کہ مُدیرانِ رسائل و اخبارات سے میری "سلام دُعا" زیادہ ہے۔)

اب تین برس بعد یہ تحریر مکان بدلتے ہوئے سامان کی اُلٹ پُلٹ میں اچانک مُجھے مِل گئی۔ اس عرصے میں پُل کے نیچے سے خاصا پانی گزر چُکا ہے، مگر ریاض احمد شاد صاحب کی بے ساختہ محبت مُجھ میں ابھی تک تازہ ہے۔ لہٰذا یہ مضمون موصوف کی اجازت کے بغیر اپنی اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ فیصلہ چُونکہ اچانک کیا گیا ہے، اِس لیے اجازت طلب کرنے کا نہ تو وقت ہے اور نہ شاد صاحب کا پتا۔ جمال احسانی

جمال احسانی، جمال اور احسان کا مرکب ہے۔ یہ اُس کا نام بھی ہے، اُس کی شخصیت بھی اور اُس کی شاعری کا بُنیادی استعارہ بھی۔ اُس کا اصل نام کیا ہے؟ خدا جانے اُسے خود بھی یاد ہے یا نہیں۔ اب تو یہ دو لفظی مُرکب ہی وہ محور ہے جس کے اردگرد وہ طواف کرتا رہتا ہے۔ اُس کی شاعری میں جتنے بھی لفظ استعمال ہوئے ہیں وہ محض اُس کوشش کا نتیجہ ہیں جو اُس نے ان لفظوں کی رُوح میں اُترنے کے لیے کی ہے۔ اِسی جتن میں اُس سے شعر سرزد ہوئے ہیں۔ یہ اُس کی لاشعوری

حرکت ہے۔ اُس کے شعر اُس کی جمالی شخصیت کا لازمی حصہ ہیں گویا خالق اور تخلیق ایک ہی جُرم میں ایک دُوسرے کے ساتھ ملوّث ہیں۔ اسلوب کے لحاظ سے جمّال احسانی مجھے بوسکی کا تھان لگتا ہے۔ نرم، مُلائم اور گُداز۔ یہی اُس کی شخصیت ہے اور یہی اُس کی شاعری۔ اگر کسی نے تازہ گلاب کی ڈھیروں پتیوں پر لیٹنے کی راحت کا مزہ لینا ہو تو وہ جمّال احسانی کی شاعری پڑھے پھر وہ کہیں بھی لیٹے یہ راحت خود بخود اُس میں رچ بس جائے گی۔

جمّال احسانی سے میری پہلی مُلاقات اُس وقت ہوئی جب وہ کوئی چار پانچ سال پہلے سرگودھا آیا تھا۔ اُس وقت وہ ایک دُبلا پتلا سا، تابع فرمان قسم کا لڑکا تھا۔ سرگودھا سے اُسے والہانہ پیار تھا۔ وہ یہاں کی گلیوں کُوچوں میں تنہا پھرتا ہوا اُن راستوں کی سرگوشیاں سُنا کرتا، جہاں اُس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ مجھے وہ ہائی اسکول کے لڑکوں جیسا اُمنگوں بھرا اور فرماں بردار سا طالب علم لگتا تھا۔ اُس وقت اُس نے جو غزلیں سُنائیں اُنھیں سُن کر میں کم از کم اس بات کا قائل ہو گیا کہ کراچی میں کچھ ایسے اچھے شاعر بھی ہیں جن کا ابھی ہمیں علم نہیں اور جن کی غزلیں یہ ہمیں سُناتا پھرتا ہے۔ خیر! میں نے سوچا، اس عُمر میں سب کا مزاج ہی شاعرانہ ہوتا ہے۔ کسی کی ایک آدھ رُومانی غزل پر ہاتھ صاف کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ پھر وہ تو ابھی بچہ ہے لوگ تو بُزرگ ہو کر بھی ایسی معصوم حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ مجھے یہ بھی قائل ہونا پڑا کہ چلو غزلیں کسی کی ہوں گی، لیکن کم بخت کا ذوق اچھا ہے۔ شعر اچھے چوری کیے ہیں اور پڑھتا بھی ٹھیک ہے۔

چار پانچ سال کے بعد گزشتہ دنوں اسلام آباد میں جمّال سے میری دُوسری مُلاقات ہوئی میں نے اُسے جب ذرا دُور سے دیکھا تو پہلی نظر میں میرے لیے پہچاننا مُشکل ہو گیا۔ کیا یہ وُہی جمّال احسانی تھا جو پہلے سے چار پانچ گنا زیادہ چربی پہنے ہوئے تھا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ چربی کی یہ زیادتی کہیں اُس کی آنکھوں تک نہ پہنچ گئی ہو۔ چلو ڈھنگ سے نہیں ملے گا، ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔ ایک سلام کر کے دیکھ لیتے ہیں: میں نے اُس سے ایک کھُردرے سے ادب کی توقع کرتے ہوئے ایک مودبانہ سی فرینک نیس کے ساتھ سلام کیا اور اُس نے کوئی جواب دینے کے بجائے مجھے ایک زوردار جپھا مار لیا۔ میں چونکہ ایسی حرکت کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے میرے دونوں بازو اُس کے جپھے میں جکڑے گئے ــــ یہ جپھا ایک طرف تو میری لاعلمی میں پڑ گیا اور دُوسری طرف یہ بالجبر تھا۔ بہرحال میں اُس کی قربانی سے بہت متاثر ہوا۔ قربانی یُوں کہ میں نے جب اُسے سلام کیا تھا تو وہ ایک خاتون سے محوِ گفتگو تھا۔ اُس نے اس محویت کو فوراً ملتوی کر کے مجھے گلے لگایا تھا۔ اب اللہ جانے یہ اُس کا خلوص تھا یا مذکورہ محویت کا نشہ ــــ

اُس سے اس دُوسری مُلاقات کے بعد احساس ہوا کہ اُس میں خلوص اور پیار کا جذبہ اُسی طرح برقرار ہے۔ اُس کا جسم ذرا پھیل گیا ہے جس سے اُس کی شخصیت بظاہر بدل گئی ہے لیکن مل کر اور خاص طور پر گلے مل کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ چار، پانچ سال پہلے کا دس، بارہ گز بوسکی کا وہ تھان اب چالیس پچاس گز کا ہو گیا ہے، لہٰذا اس سے اُس کی نرمی اور گُداز میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ میں جمال احسانی کی شخصیت کا کوئی بھرپور تعارف نہیں کروا سکتا۔ ادھوری سی دو مُلاقاتوں سے میں نے جو غیر واضح تاثر لیا تھا وہ اُس کی شاعری پڑھ کر بہت واضح ہو جاتا ہے۔ "ستارۂ سفر" میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو اُس نے چار پانچ سال پہلے سُنائی تھیں۔ اس کے بعد کی غزلوں میں وہی تیور مزید نکھر کر سامنے آئے ہیں جو پہلی غزلوں کا خاصہ تھے، چُنانچہ اس سے یا تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ نرمی، گُداز اور خلوص شروع ہی سے اُس کی شخصیت کا حصّہ ہیں اور یا یہ کہ چار پانچ سال پہلے اُس نے جس شاعر کی غزلیں چُرائی تھیں اب تک اُسی پر ہاتھ صاف کرتا آ رہا ہے۔ بہرحال شاعر کے خلوص کا ریشم اور لہجے کے گُلاب اِس کتاب کے ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ لُوٹ کر چلنے والا شخص ہے اور اسی شدّت سے چاہے جانے کا طلب گار بھی۔ چاہا اُس نے بہت ہے، لیکن چاہا گیا بہت کم ہے۔ اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جب وہ گلے ملتا ہے تو جوشِ جذبات سے دُوسرے کے بازو بھی جکڑ لیتا ہے۔ بہرحال اُس کا جذبہ اور اُس کی تڑپ دو ایسے پہلو ہیں جن کا اظہار اُس کی شاعری میں متعدد جگہوں پر ہوا ہے۔

محبتوں کی بلندی پہ ہے یقیں تو کوئی
گلے لگائے مری سطح پر اُتر کے مجھے
چراغ بن کے جلا جس کے واسطے اک عُمر
چلا گیا وہ ہوا کے سپرد کر کے مجھے

اِس تاریک فضا میں میری ساری عُمر
دیا جلانے کے امکان میں گزری ہے

کاش میں تجھ پہ ریاضی کے سوالوں کی طرح
خود کو تقسیم کروں کچھ بھی نہ حاصل آئے

جمال احسانی نے وصال کے لمحے بہت کم گزارے، لیکن جو گزارے ہیں وہ اُس کے لیے حاصلِ حیات

بھی ہیں سرچشمۂ تخلیق بھی۔ اس موضوع پر گو اُس کے اشعار بہت کم ہیں، لیکن جو ہیں وہ سرمستی اور سرخوشی کا عجیب والہانہ پن رکھتے ہیں ؎

نہ وہ حسین، نہ میں خوب رُو مگر اک ساتھ
ہمیں جو دیکھ لے وہ دیکھتا ہی رہ جائے

مری بیاض سے کاٹے ہیں کس نے شعر جمالؔ
یہ میرے بعد مرے گھر میں کون آیا تھا

جمالؔ کے ہاں ہر جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ اُس کی شاعری میں جو لینڈ اسکیپ بنتے ہیں اُن میں کھلے پانی، وسیع صحرا، لمبا سفر، چلتی ہوائیں اور پھیلا آسمان پینٹ کیے گئے ہیں۔ کھلی کھلی فضائیں لیے ہوئے اُس کے شعروں سے شاعر کی خوشی، اُس کا ذہنی اُفق، اُس کی اُمنگیں اور اُس کے خواب جھلکتے ہیں ؎

سمندروں کا سفر آج تو مزہ دے گا
ہوا بھی تیز ہے کشتی بھی بادبانی ہے

آنکھوں آنکھوں ہریالی کے خواب دکھائی دینے لگے
ہم ایسے کئی جاگنے والے نیند ہوئے صحراؤں کی !

جمالؔ ہر شہر سے ہے وہ شہر پیارا مجھ کو
جہاں سے دیکھا تھا پہلی بار آسمان میں نے

اس کے برعکس اُسے بند بند سی فضاؤں، گھٹے گھٹے ماحول اور گھیرتی ہوئی دیواروں سے وحشت ہوتی ہے۔ اُس نے اپنے متعدد شعروں میں دیواروں سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے ؎

دیواروں کا شوق جہاں تھا سب کو جمالؔ
عُمر مری اُس خاندان میں گزری ہے

بنی جو صلح کا باعث کسی دن
اُسی دیوار کا جھگڑا پڑے گا

اُس کی شاعری میں کھلے مناظر سے محبت اور تنگ ماحول سے نفرت بڑے بلیغ استعاروں کے طور پر اُبھری ہے۔ اس میں شاعر کی ذاتی واردات سے لے کر ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کے سارے رویّے سمٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سارے موضوعات ہماری روایتی شاعری کا بھی حصّہ ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ جمال احسانی کے ہاں یہ پہلو کسی روایت کا حصّہ بن کر نہیں بلکہ شاعر کی ذات کا حصّہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ ہر اچھی شاعری کی طرح اُس کے ہاں سُہانے خواب اور مثالی تصوّرات بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ صرف خواب ہی نہیں دیکھتا محسوس حقیقتوں کو بھی کھُلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ہماری روزمرّہ زندگی کے وہ تکلیف دہ پہلو جو آج کے تخلیق کار کا مقدر ہیں، جمال احسانی کی شاعری میں پُورے کرب کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور اُس کی شاعری کا یہ پہلو مجھے سب سے زیادہ اچھا لگا ہے۔

گھر بھی عزیز، شوق بھی دل میں سفر کا ہے
یہ روگ ایک پل کا نہیں عمر بھر کا ہے

ہونٹوں سے ہونٹ مل گئے دل سے ملا نہ دل
یہ بات بھول جاؤ اگر گھر بسانا ہے

بڑھا کے اُس سے رہ و رسم اب یہ سوچتے ہیں
وہی بہت تھا جو رشتہ دُعا سلام کا تھا

یہ ہجر کون جانے یہ بات کون سمجھے !!
میں اپنے گھر میں خوش ہوں وہ اپنے گھر میں خوش ہے

تیرا انجام ہُوا جو، وہی ہونا تھا جمال
اِس جہاں میں تُو کسی اور جہاں کا نکلا

ان شعروں میں جو کرب پنہاں ہے وہ دیکھنے، سمجھنے اور سوچنے والے ذہنوں کا مقدر ہے اور جمالؔ نے اسے کوئی انہونی بات نہیں جانا بلکہ مقدر کا لکھا سمجھ کر حوصلے سے اس کا سامنا کیا ہے۔ وہ حالات کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں، لیکن ان تاریک فضاؤں میں دیا جلانے کے امکان کی تلاش اُس نے نہ صرف جاری رکھی ہے بلکہ اُس نے اپنے ہر شعر میں ایک دیا جلایا ہے۔ اپنے سفر کے ہر قدم پر ایک گونج پیدا کی ہے۔ محبتیں، چاہتیں، روشنیاں، پھول اور خوشبوئیں تقسیم کی ہیں۔ وہ اپنے سفر کا خود ستارہ ہے۔ گویا ستارۂ سفر شاعر کی ذات بھی ہے اور اُس کی تخلیق کا نام بھی۔ جمالؔ احسانی اور اُس کی شاعری پر اگر ایک جامع اور مختصر تبصرہ کرنا ہو تو میرے نزدیک اُس کا یہ شعر بڑا مناسب رہے گا۔

ایک فقیر چلا جاتا ہے پکی سڑک پر گاؤں کی
آگے راہ کا سناٹا ہے پیچھے گونج کھڑاؤں کی

"۲۵ اکتوبر ۱۹۸۳ء کی شام سرگودھا میں ستارۂ سفر کی تقریبِ رُونمائی میں پڑھا گیا۔"

جَمال احسانی